خواتین کا علمی ادبی اصلاحی جریدہ

ماہنامہ چمن بتول لاہور

جولائی ۲۰۱٦ء رمضان/شوال ۱۴۳۷ھ

جلد : 14 شمارہ : 11

پتہ برائے انتظامی و مالی امور:

ماہنامہ چمن بتول، کمرہ نمبر F-14، سید پلازہ، 30 فیروز پور روڈ،

لاہور۔54600 فون: 0321-5933338-042-37424409

chamanebatool7585@gmail.com

مجلس ادارت

نگران	ثریا اسماء
مدیرہ	صائمہ اسماء
نائب مدیرہ	آسیہ راشد

پتہ برائے ادارتی امور:

28۔اے الفا سوسائٹی کینال روڈ، پوسٹ آفس نیو کیمپس

لاہور۔54590فون:35293624-35293604

ای میل:idarabatool@yahoo.com

ویب سائٹ: www.batool.com.pk

قیمت 40روپے

سالانہ 400روپے

امریکہ، کینیڈا	2800 روپے
یورپ، مشرق وسطیٰ	2000 روپے
بنگلہ دیش، ایران، بھارت	1900 روپے

کراچی بیورو:

c/o بلال ایسوسی ایٹس ۔ مختار گوہر E-261ای مارکیٹ

بلاک 6پی ای سی ایچ ایس کراچی

فون:021-35313695/6

فیکس:021-35313697 مختار گوہر۔0321-8750587

ای میل : syedmgh2013@gmail.com

نوٹ: خط و کتابت اور بدل اشتراک ارسال کرتے ہوئے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

ڈاکٹر امتیاز علی پبلشرز نے میٹرو پرنٹرز سے چھپوا کر دفتر ادارہ بتول F-14سید پلازہ،30فیروز پور روڈ، لاہور سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوار ربانی	ربِّ ارحمھما	مفتی محمد شفیع	8
قولِ نبیؐ	صبر	عائشہ ایاز	12
خاص مضمون	خواتین کے دینی مدارس	ڈاکٹر آسیہ شبیر	14
نوائے شوق	زندگی شرمندگی	حبیب الرحمان	21
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف	22
	غزلیہ	آمنہ رمیضا زاہدی	22
	غزل	کرامت بخاری	23
	غزل	ذکیہ فرحت	23
حقیقت و افسانہ	میں ترے جمال کا عکس تھا	عافیہ رحمت	24
	ڈھائی منٹ	حاجرہ ریحان	26
	ڈاکٹر بیوی ڈاکٹر بہو	نوشین اصغر	31
	ہم زیاں کار سہی	صبیحہ نبوت	35
	ٹھنڈا چشمہ	فرح وقار	39
طویل کہانی	کبھی چاند راہوں میں کھو گیا	فرحی نعیم	42
سیر و سیاحت	مجھے گھر جانا ہے	ربیعہ ندرت	50
	تمہارے شہر کا موسم	فرحت طاہر	53
مطالعہ گاہ	زندگی کے چار نظریے	حمیرا خالد	58
نہاں خانۂ دل	تمہاری وفا ہمارا اثاثہ	افشاں نوید	62
	عظمت وطن کا شہید	ذکیہ فرحت	65
حسن و صحت	لکھنا اور چہل قدمی	فریدہ خالد	67
پل صراط پر	فطرت کو مسخ ہونے سے بچائیں	آسیہ عمران	69
محشرِ خیال	نجمہ یاسمین یوسف، حبیب الرحمان، فریدہ خالد، عافیہ رحمت، زینب وسیم		72
بتول میگزین	نورافرا، تنویر خانم، کرن وسیم، زینب وسیم		76
گوشۂ تسنیم	عید کا دن	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	80

D/arshad hussain/2015/batool20015/fehrest nov 15

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! ماہِ مبارک کی اختتامی گھڑیاں ہیں، عشرہ اخیرہ کی منور ساعتیں ہیں جس کی راتوں میں سے ایک رات میں کلام پاک کا نزول ہوا، انسانیت کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نجات ملی، اور رہتی دنیا تک کے لیے ہدایت کا راستہ عطا ہوا۔ پرچہ آپ کے ہاتھوں میں آنے تک عیدالفطر بھی گزر چکی ہوگی۔ دعا ہے کہ ماہِ صیام اور عید کی برکتیں سمیٹنے والوں میں رب تعالیٰ ہمارے بھی نام لکھ لے! آمین۔

کراچی ایک بار پھر جرائم کے نشانے پر ہے۔ ٹارگٹ کلنگ اور اغوا کے تازہ واقعات نے ایک بار پھر ملک میں خوف و ہراس اور غم و غصہ کی فضا پیدا کر دی ہے۔ ابھی تو بااثر افراد کے بیرونِ ملک اثاثوں کا ردعمل ہی ٹھنڈا نہیں پڑا تھا کہ تازہ واقعات نے بے چینی بڑھا دی۔ قوال امجد صابری کا قتل کراچی میں ہونے والی نمایاں افراد کی ٹارگٹ کلنگ کے سینکڑوں واقعات کا تازہ تسلسل ہے، جس کا شکار بلاتخصیص ہر شعبۂ زندگی کے لوگ ہوئے۔ ان میں علمائے کرام، حکومتی عہدیداران، پولیس اور سیکیورٹی کے افسران، سیاسی قائدین، اساتذہ، دانشور، سوشل ورکرز، فنکار سبھی شامل ہیں۔ یہ عوام کو تحفظ فراہم کرنے کے سب حکومتی دعووں کی کھلی ناکامی ہے۔ فوج کی کی ہوئی محنت بے لاگ عدالتی کارروائی کا تقاضا کرتی ہے۔ دہشت گردی میں ملوث مجرموں اور ان کے سیاسی سرپرستوں کو جب تک قوم کے سامنے عبرت کا نشان نہیں بنایا جائے گا، ہم ایسے واقعات کا شکار ہوتے رہیں گے۔ اسی طرح کرپشن کے خلاف تحقیقاتی اداروں کی رپورٹیں بھی عملدرآمد کی منتظر ہیں، مگر اہم سیاسی شخصیات پر ہاتھ کون ڈالے!!! امجد صابری کے قاتلوں کے پکڑے جانے کی خبر بھی گردش میں ہے اور اس کے سیاسی سرپرستوں کا علم بھی ہے۔ دیکھیے اس بار کیا ہوتا ہے۔

مصر میں آمرانہ حکومت نے ملک کے پہلے جمہوری اور عوامی صدر مرسی کو عمر قید اور پھانسی کی سزا سنا دی ہے۔ ساتھ ہی اخوان قیادت کی خاتون رہنما اسماالخطیب کو بھی پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے۔ ''مہذب'' مغربی دنیا میں سے کسی نے ان سزاؤں بلکہ خاتون کی سزائے موت پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ مسلمانوں کے لیے مغرب کے یہ دہرے معیار اب کھل کر سامنے آ چکے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمان انسانی حقوق تو کیا جانداروں کے حقوق کی تشریح میں بھی نہیں آتے۔ خود اسلامی دنیا جو مغربی آقاؤں کے گماشتوں کے کنٹرول میں ہے، کوئی احتجاج کرنے سے قاصر رہی۔ خال خال کوئی آواز اٹھی، یا پھر عوامی سطح سے جذبات کا اظہار ہوا۔ عرب دنیا میں حکمرانوں کی اکثریت اپنی بادشاہتوں کے تحفظ کی خاطر اخوان المسلمون کی جمہوری جدوجہد کو دبانے کے حق میں ہے۔ پاکستان اسلامی دنیا کی پہلی ایٹمی طاقت ہو کر بھی کوئی جرأت مندانہ کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ بلکہ ہم بنگلہ دیش میں پاکستان کے لیے سولی چڑھ جانے والوں سے بھی لاتعلق رہے، تو مصر کے حالات پر کیا احتجاج کرتے۔ شام کے شہری اپنی حکومت کے بعد اب امریکی اور روسی بمباری کی زد پر ہیں۔ معصوم بچوں کی لاشوں پر نوحہ خواں مائیں اور جوان باپوں کی میتوں پر بلکتے بچوں کے دلدوز مناظر...... دنیا دیکھ رہی ہے اور بے بس ہے یا بے حس ہے۔ کہتے ہیں قربِ قیامت ہے۔۔۔ اس سے بڑھ کر تو قیامت کا بھی تصور محال ہے! مرنے والوں کے علاوہ اسلامی دنیا میں تازہ بحرانوں کے نتیجے میں چھ کروڑ ۵۳ لاکھ پرامن شہری مہاجرین بن چکے ہیں جن میں آدھی تعداد بچوں کی ہے۔ دس ہزار افراد ہجرت کی کوشش میں سمندر میں ڈوب کر جاں بحق ہو چکے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ مسلمانوں کو اس دورِ ابتلا سے نکالے، امت کو

اتحاد کی توفیق دے تاکہ مسلمان اپنوں اور غیروں کے ظلم سے نجات پاسکیں آمین۔

انگلینڈ میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے حقوق کی حامی عوامی نمائندہ جوکوکس کو ایک جنونی نے قتل کر دیا۔ وہ دہشت گرد قرار نہیں پایا کیونکہ وہ مسلمان نہیں تھا۔ تعصب، نفرت، عدم برداشت اور وحشت کا جو مظاہرہ مغرب میں ہوتا ہے اس پر کوئی بیانیے تشکیل نہیں پاتے، مگر کوئی بگڑا ہوا مسلمان بھی جرم کرے تو اس کا الزام مسلمانوں اور ان کے مذہب پر آتا ہے۔ نسلی تفاخر اور باہر سے آنے والوں کے لیے نفرت کا یہ احساس اس قوم میں کتنا سرایت کر گیا ہے اس کا اندازہ حالیہ ریفرنڈم کے نتائج سے ہوتا ہے جس میں برطانوی عوام کی اکثریت نے یورپی یونین سے الگ ہو جانے کو ترجیح دی ہے۔ اس رائے کے حامی افراد کا کہنا ہے کہ وہ خالص اپنا کلچر چاہتے ہیں جو دوسرے لوگوں کے آنے سے خراب ہو رہا ہے، اور دوسرے ممالک سے لوگوں کا اپنے ملک میں آ کر بس جانا پسند نہیں کرتے۔ برطانوی عوام کا یہ فیصلہ ایک طرف تو مسلمانوں کو جھنجوڑ رہا ہے جو جوق در جوق اپنے ملک چھوڑ کر غیروں کے دیس جا بسنے کو کامیابی تصور کرتے ہیں جبکہ اپنے ملک میں سب کچھ ہے۔ دوسری طرف یہ اس پروپیگنڈے کی حقیقت بھی کھول رہا ہے کہ اب جدید دور میں پاکستان اور بھارت کے درمیان تفریق کو مٹا دینا چاہیئے۔ اگر انگلینڈ دیگر یورپی ممالک کے ساتھ سرحدیں کھولنے پر آمادہ نہیں ہے، جبکہ ان کا تو تمام تمام تاریخی ورثہ، نسل اور رہن سہن بھی مشترک ہے، تو پاکستان تو بنا ہی دو قومی نظریے کی بنیاد پر تھا، یہ بھارتی ہندوانہ کلچر کو کیسے ہضم کر سکتا ہے!

ٹی وی چینلوں پر رمضان ٹرانسمیشن کے نام پر ریٹنگ بڑھانے کے لیے رمضان کا تقدس خوب پامال ہوا۔ عبادت، خود احتسابی، دعا اور نیکیاں کمانے کے اس سنہری موقعے کو کھیل تماشے، مسخرہ پن اور لغویات کی نذر کر کے خوب پیسے بنائے گئے۔ حالانکہ پیسے کمانے کے لیے اچھے اور رمضان کے شایانِ شان پروگرامات بھی پیش کیے جا سکتے تھے۔ اس سلسلے میں پی ٹی وی نے اس بھیڑ چال سے ہٹ کر باوقار نشریات پیش کیں۔ باقی چینلز کو بھی اس کی تقلید کرنی چاہیئے تھی۔ پیمرا کی جانب سے اس سلسے میں مناسب ضابطہ اخلاق بنانے کا تقاضا عوام کی کثیر تعداد نے سوشل میڈیا کے ذریعے کیا۔ امید ہے کہ آئندہ رمضان المبارک کے موقع پر بہتری دیکھنے کو ملے گی۔

خواتین کے دینی مدراس کے عنوان سے خاص مضمون کا دوسرا حصہ بوجوہ کچھ ماہ کے وقفے کے بعد اس بار شائع کیا جا رہا ہے، قارئین نوٹ فرما لیں۔

معروف دانشور، ادیب، ناول نگار، کالم نگار، میڈیا کے ماہر اور دستاویزی فلموں کے خالق عبید اللہ بیگ انتقال کر گئے۔ پرانے وقتوں کے رکھ رکھاؤ والے اور علم و ہنر کے قدردان شخص تھے۔ حکومت کی جانب سے ان کی خدمات پر انہیں پرائڈ آف پرفارمنس بھی دیا گیا۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے آمین۔

دعاؤں میں یاد رکھیے۔

صائمہ اسما

رَبِّ ارۡحَمۡهُمَا

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ:''والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوکر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت اور شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کیلئے درگذر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہوکر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔ (بنی اسرائیل آیات ۲۳ تا ۲۵)

والدین کے ادب واحترام اور اطاعت کی اہمیت

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب واحترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے **اَنِ اشْكُرْ لِىْ وَلِوَالِدَيْكَ** (یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ، کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گذار ہونا واجب ہے صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی اسی پر شاہد ہے جس میں ہے کہ رسول اللہؐ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ ''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کیا ہے'' آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''نماز اپنے وقت (مستحب) میں۔ اُس نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپؐ نے فرمایا ''والدین کے ساتھ اچھا سلوک'' (قرطبی)

والدین کی اطاعت وخدمت کے فضائل روایاتِ حدیث میں

(۱) مسند احمد۔ ترمذی، ابن ماجہ، متدرک حاکم میں بسند صحیح حضرت ابو الدرداؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کی حفاظت کرو یا ضائع کردو (مظہری) (۲) اور جامع ترمذی ومتدرک حاکم میں حضرت عبداللہ ابن عمر کی روایت ہے اور حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''اللہ کی رضا، باپ کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں۔

(۳) ابن ماجہ نے بروایت حضرت ابو امامہؓ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''وہ دونوں ہی تیری جنت یا دوزخ ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت وخدمت جنت میں لے جاتی ہے اور ان کی بے ادبی اور ناراضی دوزخ میں۔

(۴) بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن عسا کرنے بروایت حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''جو شخص اللہ کے لئے اپنے ماں باپ کا فرمانبردار رہا اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور جو ان کا نافرمان ہوا اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی تھا تو ایک دروازہ (جنت یا دوزخ کا کھلا رہیگا) اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ (یہ جہنم کی وعید) کیا اس صورت میں بھی ہے کہ ماں باپ نے اس شخص پر ظلم کیا ہو تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا **وَاِنْ ظَلَمَا وَاِنْ ظَلَمَا وَاِنْ ظَلَمَا** (یعنی ماں باپ کی نافرمانی اور ان کو ایذارسانی پر جہنم کی

وعید ہے خواہ ماں باپ نے ہی اولاد پر ظلم کیا ہو جس کا حاصل یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے انتقال لینے کا حق نہیں کہ انہوں نے ظلم کیا تو یہ بھی ان کی خدمت واطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں)

(۵) بیہقی نے بروایت حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جو خدمت گذار بیٹا اپنے والدین پر رحمت وشفقت سے نظر ڈالتا ہے تو ہر نظر کے بدلے میں ایک حج مقبول کا ثواب پاتا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ دن میں سو مرتبہ اس طرح نظر کرلے، آپؐ نے فرمایا کہ ''ہاں سو مرتبہ بھی (ہر نظر پر یہی ثواب ملتا رہے گا) اللہ تعالیٰ بڑا ہے (اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی)''

والدین کی حق تلفی کی سزا، آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اور سب گناہوں کی سزا تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں قیامت تک موخر کر دیتے ہیں بجز والدین کی حق تلفی اور نافرمانی کے کہ اس کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی دی جاتی ہے (یہ سب روایات تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں)

والدین کی اطاعت کن چیزوں میں واجب ہے اور کہاں مخالفت کی گنجائش ہے

اس پر علماء وفقہاء کا اتفاق ہے کہ والدین کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے ناجائز یا گناہ کے کام میں اطاعت واجب تو کیا جائز بھی نہیں حدیث میں ہے **لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق** (یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں)

والدین کی خدمت اور اچھے سلوک کیلئے ان کا مسلمان ہونا ضروری نہیں

امام قرطبیؒ نے اس مسئلہ کی شہادت میں حضرت اسماءؓ کا یہ واقعہ صحیح بخاری سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماءؓ نے آنحضرتؐ سے استفسار کیا کہ میری والدہ جو مشرک ہے مجھ سے ملنے کے لئے آتی ہے کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کی خاطر مدارات کروں آپ نے فرمایا ''**صِلِیْ اُمَّکِ**'' (یعنی اپنی ماں کی صلہ رحمی اور خاطر مدارات کرو) اور کافر ماں باپ کے بارے میں خود قرآن کریم کا یہ ارشاد موجود ہے **وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْيَا مَعْرُوْفاً** یعنی جس کے ماں باپ کافر ہوں اور اس کو بھی کافر ہونے کا حکم دیں تو ان کا اس معاملے میں حکم ماننا تو جائز نہیں مگر دنیا میں ان کے ساتھ معروف طریقہ کا برتاؤ کیا جائے ظاہر ہے کہ معروف طریقہ سے یہی مراد ہے کہ ان کے ساتھ مدارات کا معاملہ کریں۔

مسئلہ: جب تک جہاد فرض عین نہ ہو جائے فرض کفایہ کے درجے میں رہے اس وقت تک کسی لڑکے کے لئے بغیر ان کی اجازت کے جہاد میں شریک ہو جانا جائز نہیں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں شریک جہاد ہونے کی اجازت لینے کے لئے حاضر ہوا آپؐ نے اس سے دریافت کیا کہ ''کیا تمہارے والدین زندہ ہیں'' اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں آپؐ نے فرمایا **ففيهما فجاهد** یعنی بس تو اب تم ماں باپ کی خدمت میں رہ کر جہاد کرو مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت ہی میں تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ دوسری روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اس شخص نے یہ بیان کیا کہ میں اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں اس پر آپؐ نے فرمایا کہ ''جاؤ ان کو ہنساؤ جیسا کہ ان کو رُلایا ہے'' یعنی ان سے جا کر کہہ دو کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف جہاد میں نہیں جاؤنگا۔ (قرطبی)

مسئلہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز فرض عین یا واجب علی العین نہ ہو کفایہ کے درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں اس میں مکمل علم دین حاصل کرنا اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرض علم دین جس کو حاصل ہو وہ عالم بننے کے لئے سفر کرے یا لوگوں کو تبلیغ ودعوت کے لئے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین کے جائز نہیں۔

مسئلہ: والدین کے ساتھ جو حسن سلوک کا حکم قرآن وحدیث میں آیا ہے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ جن لوگوں سے والدین کی قرابت یا دوستی تھی ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے خصوصاً ان کی وفات کے بعد۔ صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''باپ کے ساتھ بڑا سلوک یہ ہے کہ اس کے

مرنے کے بعد اس کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے'' اور حضرت ابواسید بدریؓ نے نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہؐ کے ساتھ بیٹھا تھا ایک انصاری شخص آیا اور سوال کیا یا رسول اللہؐ ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی انکا کوئی حق میرے ذمہ باقی ہے آپؐ نے فرمایا ہاں۔ان کے لئے دعا اور استغفار کرنا اور جو عہد انہوں نے کسی سے کیا تھا اس کو پورا کرنا اوران کے دوستوں کا احترام کرنا اوران کے ایسے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا جنکا رشتہ قرابت صرف انہیں کے واسطے سے ہے والدین کے یہ حقوق ہیں جو ان کے بعد بھی تمہارے ذمہ باقی ہیں۔

آنحضرتؐ کی عادت تھی کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے جس سے حضرت خدیجہؓ کا حق ادا کرنا مقصود تھا۔

والدین کے ادب کی رعایت خصوصاً بڑھاپے میں

والدین کی خدمت واطاعات والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانے اور کسی عمر کے ساتھ مقیدنہیں ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے لیکن واجبات وفرائض کی ادائیگی میں جو حالات عادۃً رکاوٹ بنا کرتے ہیں ان حالات میں قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت بھی کرتا ہے اور ایسے حالات میں تعمیل احکام کی پابندی کی مزید تاکید بھی۔

والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہوجائیں ان کی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر رہ جائے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذراسی بے رخی بھی محسوس ہوتو وہ ان کے دل کا زخم بن جاتی ہے۔دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑ چڑا بنا دیتے ہیں تیسرے بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل وفہم بھی جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی خواہشات ومطالبات کچھ ایسے بھی ہوجاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لئے مشکل ہوتا ہے قرآن حکیم نے ان حالات میں والدین کی دلجوئی اورراحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح انہوں نے اپنی راحت وخواہشات کو اس وقت تم پر قربان کیا اور تمہارے بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا تو عقل وشرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اس سابق احسان کا بدلہ ادا کرو آیت میں **كَمَا رَبَّيَانِى صَغِيراً** سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آیات مذکورہ میں والدین کے بڑھاپے کی حالت کو پہنچنے کے وقت چند تاکیدی احکام دیئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ ان کو اُف بھی نہ کہے لفظ اُف سے مراد ہر ایسا کلمہ ہے جس سے اپنی ناگواری کا اظہار ہو یہاں تک کہ ان کی بات سن کر اس طرح لمبا سانس لینا جس سے ان پر ناگواری کا اظہار ہو وہ بھی اسی کلمہ اُف میں داخل ہے ایک حدیث میں بروایت حضرت علیؓ رسول کریمؐ کا ارشاد ہے کہ ایذارسانی میں اُف کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا (حاصل یہ ہے کہ جس چیز سے ماں باپ کو کم سے کم بھی اذیت پہنچے وہ بھی ممنوع ہے)

دوسرا حکم لفظ **نهر** کے معنی جھڑ کنے ڈانٹنے کے ہیں اس کا سبب ایذا ہونا ظاہر ہے۔تیسرا حکم پہلے دو حکم **وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيْماً** منفی پہلو سے متعلق تھے جن میں والدین کی ادنیٰ سے ادنیٰ بار خاطر کو روکا گیا ہے۔اس تیسرے حکم میں مثبت انداز سے والدین کے ساتھ گفتگو کا ادب سکھلایا گیا ہے کہ ان سے محبت وشفقت کے نرم لہجہ میں بات کی جائے۔حضرت سعید بن مسیب نے فرمایا جس طرح کوئی غلام اپنی سخت مزاج آقا سے بات کرتا ہو۔چوتھا حکم **واخفض لهما جناح الذل من الرحمة** جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے سامنے اپنے آپ کو عاجز وذلیل آدمی کی صورت میں پیش کرے جیسے غلام آقا کے سامنے، جناح کے معنی بازو کے ہیں لفظی معنی یہ ہیں کہ والدین کے لئے اپنے بازو عاجزی اور ذلت کے ساتھ جھکائے آخر میں **من الرحمة** کے لفظ سے ایک تو اس پر متنبہ کیا کہ والدین کے ساتھ یہ معاملہ محض دکھاوے کا نہ ہو بلکہ قلبی رحمت وعزت کی بنیاد پر ہو دوسرے شاید اشارہ اس طرف بھی ہے کہ والدین کے سامنے ذلت کے ساتھ پیش آنا حقیقی عزت کا

مقدمہ ہے کیونکہ یہ واقعی ذلت نہیں بلکہ اس کا سبب شفقت ورحمت ہے۔

پانچواں حکم **وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا** ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ والدین کی پوری راحت رسانی تو انسان کے بس کی بات نہیں اپنی رحمت سے ان کی سب مشکلات کو آسان اور تکلیفوں کو دور فرمائے یہ آخری حکم ایسا وسیع اور عام ہے کہ والدین کی وفات کے بعد بھی جاری ہے جس کے ذریعہ وہ ہمیشہ والدین کی خدمت کرسکتا ہے۔

مسئلہ: والدین اگر مسلمان ہوں تو ان کے لئے رحمت کی دعا ظاہر ہے لیکن اگر وہ مسلمان نہ ہوں تو ان کی زندگی میں یہ دعا اس نیت سے جائز ہوگی کہ ان کی دنیوی تکلیف سے نجات ہو اور ایمان کی توفیق ہو مرنے کے بعد ان کے لئے دعا رحمت جائز نہیں (قرطبی ملخصا)

ایک واقعہ عجیبہ

قرطبی نے اپنی اسناد متصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ اسی وقت جبرائیل امین تشریف لائے اور رسول اللہؐ سے کہا کہ جب اس کا باپ آجائے تو آپؐ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات کیا ہیں جو اس نے دل میں کہے ہیں خود اس کے کانوں نے بھی ان کو نہیں سنا جب یہ شخص اپنے والدین کو لیکر پہنچا تو آپؐ نے والد سے کہا کہ کیا بات ہے آپ کا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کا مال چھین لیں والد نے عرض کیا کہ آپؐ اسی سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اس کی پھوپھی خالہ یا اپنے نفس کے سوا کہاں خرچ کرتا ہوں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ **ایہ** (جس کا مطلب یہ تھا کہ بس حقیقت معلوم ہوگئی اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں) اس کے بعد اس کے والد سے دریافت کیا کہ وہ کلمات کیا ہیں جن کو ابھی تک خود تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا، اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ ہمیں ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ آپ پر ہمارا ایمان اور یقین بڑھا دیتے ہیں (جو بات کسی نے نہیں سنی اس کی آپ کو اطلاع ہوگئی جو ایک معجزہ ہے) پھر اس نے عرض کیا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار دل میں کہے تھے جن کہ میرے کانوں نے بھی نہیں سنا آپؐ نے فرمایا کہ وہ ہمیں سناؤ اس وقت اس نے اپنے کچھ اشعار سنائے جن کا ترجمہ ذیل ہے:

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا۔ جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کے سبب بیداری اور بیقراری میں گذاری گویا کہ تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے تمہیں نہیں جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے پہلے پیچھے نہیں ہوسکتی پھر جب تم اس عمر اور اس حد کو پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا، تو تم نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنا دیا گویا کہ تمہی مجھ پر احسان و انعام کر رہے ہو۔ کاش اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہوسکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے جیسا ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے۔ تو کم از کم مجھے پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔

رسول اللہؐ نے یہ اشعار سننے کے بعد بیٹے کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا۔ **انت و مالک لابیک** یعنی جا تو بھی اور تیرا مال بھی سب باپ کا ہے (تفسیر قرطبی ۲۴۶ ج۔۱)

مذکورہ آیات میں سے آخری آیت **رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوْسِكُمْ** میں اس دل تنگی کو رفع فرما دیا گیا ہے جو والدین کے ادب وتعظیم کے متعلقہ احکام مذکورہ سے اولاد کے دل میں پیدا ہوسکتی ہے کہ والدین کے ساتھ ہر وقت رہنا ہے ان کے اور اپنے حالات بھی ہر وقت یکساں نہیں ہوتے کسی وقت زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جو مذکورہ الصدر آداب کے خلاف ہو تو اس پر جہنم کی وعید ہے اس طرح گناہ سے بچنا سخت مشکل ہوگا اس آیت میں اس شبہ اور اس سے دل تنگی کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ بغیر ارادہ بے ادبی کے کبھی کسی پریشانی یا غفلت سے کوئی کلمہ صادر ہو جائے اور پھر اس سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے واقف ہیں کہ وہ کلمہ بے ادبی یا ایذا کے لئے نہیں کہا تھا وہ معاف فرمانے والے ہیں لفظ اوابین بمعنے توابین ہے حدیث میں

عائشہ ایاز

صبر

بعد مغرب کی چھ رکعات اور اشراق کی نوافل کو صلوٰۃ الاوابین کہا گیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ ان نمازوں کی توفیق انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اوابین اور توابین ہیں۔(معارف القرآن)☆

حضرت ابو سعید اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''مسلمان کو جو بھی تھکان، بیماری، فکر غم اور تکلیف پہنچتی ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے (بخاری و مسلم)۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْ ءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْن ٢ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْن۔(سورہ البقرہ 155-156-157)

اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ کی ہی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔'' انہیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہیں اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔

صبر کیا ہے؟

اصطلاح میں صبر اس کو کہتے ہیں کہ اپنے نفس کو گھبراہٹ اور پریشانی سے روکا جائے۔ صبر کی وہ تعریف نہایت عمدہ ہے جو امام راغبؒ نے بیان کی۔ آپ نے فرمایا ''صبر کے معنی ہیں اپنے جی کو اس طرح روکے رکھنا جس طرح عقل اور شرع کا تقاضا ہے۔'' یعنی جب کسی کو تکلیف دہ یا اذیت ناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑ جائے تو جذبات کا شکار ہو جانے کے بجائے ایسا طرز عمل اختیار کیا جائے جو عقل پر مبنی اور شریعت کی رو سے پسندیدہ ہو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''صبر ایمان کا سرچشمہ ہے جب تک صبر ہے ایمان ہے۔ اور جب صبر گیا تو ایمان بھی جاتا رہا۔''

صبر کی اہمیت:

صبر کی دو صورتیں ہیں (۱) جو ناپسند ہوا سے برداشت کرنا۔

(۲) جو پسند ہوا سکا انتظار کرنا۔

اس دنیا میں انسانوں پر مصیبتوں اور مشقتوں کے وقت بھی آتے ہیں کبھی بیماری آتی ہے، کبھی محتاجی اور ناداری کی صورت ہو جاتی ہے، کبھی ظالم دشمن ستاتے ہیں۔ کبھی کسی قسم کے غم اور فکر لاحق ہوتے ہیں۔ کبھی دوسرے طریقوں سے حالات ناموافق ہو جاتے ہیں۔ پس ایسے ہی موقعوں کیلئے اسلام کی خاص تعلیم یہ ہے کہ اللہ کے بندے صبر اور ہمت سے کام لیں۔ انسانوں کو پہنچنے والے مصائب اور تکالیف کو اللہ تعالیٰ بندوں کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ اس صورت میں جب بندہ مومن صبر کرتا ہے۔ اس کے برخلاف بے صبری اور ناشکری کرنے والا نہ صرف یہ کہ ان عظیم اجر و انعام سے محروم رہے گا۔ بلکہ اس کم ہمتی پر اسے مزید گناہوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا، لہٰذا بزرگان دین نے بالکل صحیح فرمایا ہزار عبادتوں کی ایک عبادت ہے جس سے انسان روحانی اعتبار سے ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

صبر کا مقصد

قرآن ایمانی تقاضوں کے سلسلے میں جس صبر کو مطلوب ٹھہراتا ہے، یہ وہ صبر عظیم ہے جس کی دینی جدوجہد میں ضرورت پڑتی ہے۔ اس صبر میں

یقیناً صبر واستقلال کی دونوں ہی قسم کی قوتیں شامل ہیں۔ وہ بھی جو خلقی طور پر ہر مسلمان کے اندر آپ سے آپ موجود ہوتی ہے، اور وہ بھی جو اسلام سے رشتہ جوڑنے کے بعد اسے لازماً حاصل ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ آزمائشوں کے ذریعہ یہ تو دیکھنا ہی چاہتا ہے کہ میں نے بندے کے اندر صبر کی جتنی قوت رکھ دی ہے اس سے وہ دین وایمان کیلئے کہاں تک کام لیتا ہے۔

حضرت علیؓ نے صبر کو ارکان ایمان میں سے ایک رکن قرار دیا ہے اور اسے جہاد، عدل اور یقین کیساتھ ملاتے ہوئے فرمایا: اسلام چار ستونوں پر مبنی ہے۔یقین، صبر، جہاد اور عدل (بحوالہ انٹرنیٹ، صبر کی اہمیت اور فضیلت)

صبر کیسے پیدا کیا جائے؟

انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ خود نیک بننے اور اپنے اردگرد نیکی پھیلانے کیلئے کوشاں رہے جو کہ صبر سے کام لیے بغیر ممکن نہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں اس بات پر غور کرنا پڑتا ہے کہ آخر وہ کونسے ذرائع ہیں جنہیں اختیار کر کے صبر جیسی پسندیدہ صفت کو نشوونما دی جاسکتی ہے۔

جب انسان اس حقیقت کو پیش نظر رکھے گا کہ بنی نوع انسان میں سے کوئی بھی غم کے کانٹے سے نہیں بچتا تو وہ بہت حد تک اس خیال سے بچا رہے گا کہ دنیا میں صرف وہی ایک غمزدہ ہے باقی ساری دنیا تو عیش کے جھولے جھول رہی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر مصیبت سے بڑی مصیبت دنیا میں موجود ہے۔ جس وقت کسی پریشانی سے دو چار ہونا پڑے تو یہ یاد کر لینا چاہیے کہ اس تکلیف سے بڑی تکلیف بھی تو آسکتی تھی۔ انسانی زندگی کیلئے مصائب اور پریشانیاں ایک لازمی امر ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا کہ مومن کی مثال کھیتی کی سی ہے کہ اس کو ہوائیں برابر ہلاتی رہتی ہیں۔ اور مومن کو ہمیشہ مصیبتیں پہنچتی رہتی ہیں۔ (ترمذی)

اسلام کے دو عقیدے بھی ایسے ہیں کہ جتنا ان پر ایمان زیادہ پختہ ہوگا اتنا ہی صابر بننا آسان ہو جائیگا، یعنی عقیدۂ تقدیر اور عقیدۂ آخرت اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو ہمارے ہر کام میں صبر و برداشت میں کمی نظر آتی ہے۔ اکثر اوقات چھوٹی سی تکلیف یا پریشانی پر ہماری بے صبری کی وجہ سے ہمارے مسائل بڑھ جاتے ہیں۔

صبر کے فوائد

حضرت علیؓ کا فرمان ہے ''صابر اپنی کامیابی کو ضائع نہیں کرتا، زمانہ خواہ کتنا ہی گزرے۔'' (صبر بنت الاسلام) مراد یہ ہے کہ چاہے کتنی ہی دیر ہو جائے صبر کرنیوالا آخر کار کامیاب ضرور ہوگا۔

حالات خواہ کچھ بھی ہوں فاقہ ہو مالی یا جانی نقصان ہو مثلاً بیماری یا کوئی بھی حادثہ، ہمیں صرف اللہ پر ہی بھروسہ کرنا ہے، اللہ ہی کو یاد رکھنا ہے، صبر کیساتھ حالات کا مقابلہ کرنا ہے، اپنے منہ پر ایسے کلمات نہیں لانے جن سے ناشکری ہو جائے۔ سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کام کرنے والوں کا کیا ہی اچھا اجر ہے، جنہوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا کہ مومن کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے، تھکاوٹ ہو یا غم یا بیماری یہاں تک کہ فکر بھی جو اسے رنجیدہ کردے، اس کے باعث بھی اللہ تعالیٰ اس کے گناہ دور کر دیتا ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا کہ جب کسی بندے کا بیٹا مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ کیا تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی؟ وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نے اس کے دل کے پھل کو لے لیا، وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں، اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ پھر میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ عرض کرتے ہیں اس نے آپ کی تعریف کی اور انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کیلئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اسکا نام ''بیت الحمد'' رکھو (ترمذی)

اللہ ہم سب کو صبر کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے اور اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔ آمین

استفادہ: صبر از بنت الاسلام

☆......☆......☆

خاص مضمون
آخری حصہ

☆ڈاکٹر آسیہ شبیر

خواتین کے دینی مدارس اور ہماری معاشرتی ضروریات

اس مضمون کا پہلا حصہ مارچ میں شائع ہوا۔ دوسرا حصہ بوجوہ اب شائع کیا جا رہا ہے

محدود مطالعہ

جدید طرز تدریس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ کسی بھی مضمون کے نصاب پر مقررہ کتب کے علاوہ مجوزہ کتب (recommended books) کی ایک فہرست طلبہ واساتذہ کو مہیا کی جاتی ہے جو اس موضوع کی مختلف جہات سے آشنا کرواتی ہیں۔

ہمارے مدارس دینیہ میں مقررہ نصاب پر تو بہت زور ہے، تفصیلی اور ہمہ جہت مطالعے کی طرف توجہ نہیں ہے۔ مدارس کی انتظامیہ اور اساتذہ سے سروے میں سوال کیا گیا کہ تدریس کے لیے علوم وفنون کی ایک ہی کتاب مقرر کی جاتی ہے یا طالبات سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ دیگر کتب کا مطالعہ بھی کریں۔ 90% رائے یہ سامنے آئی کہ صرف ایک کتاب مقرر کی گئی ہے۔ اس سے زیادہ کتابیں پڑھنے کی نہ ضرورت ہے، نہ وقت میسر ہے۔ ایک صدر مدرسہ نے لکھا" جب طالبات مدرسے سے فارغ ہوں گی تو وہ خود اور کتابیں دیکھ سکتی ہیں۔ مدرسے میں تعلیم کے دوران اس کی اجازت نہیں ہے۔" ایک اور مدرسہ نے لکھا'' ہم طالبات سے کہتے ہیں کہ پہلے کتاب ہمیں دکھائیں۔ اگر وہ اس" قابل" ہو کہ طالبات اسے پڑھ سکتی ہیں تو انھیں اجازت دیتے ہیں ورنہ نہیں۔''

دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ عام طور پر مدارس میں بڑی لائبریاں موجود نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو بھی تو اپنے محدود اور مسلکی نقطۂ نظر کے علاوہ کوئی کتاب وہاں نہیں رکھی جاتی۔ یہ معاملہ مدارس میں انفرادی سطح پر نہیں، وفاق اور بورڈ کی سطح پر ایک طے شدہ پالیسی کے تحت باقاعدہ متعین ہے۔ سلیم منصور خالد لکھتے ہیں:

'' دینی مدارس کے نصاب میں بظاہر کوئی فرقہ وارانہ چیز دکھائی نہیں دیتی۔ اکثر کتب علم وفن پر مبنی ہیں۔ البتہ چاروں مسالک کے مختلف مدرسوں کی انتظامیہ کے ذوق اور ترجیحات کے تابع ہدف متعین ہوتا ہے۔ بعض مدارس تو اس حوالے سے اپنے تخصص میں شہرت بھی رکھتے ہیں مثلاً وفاق المدارس العربیہ پاکستان (دیو بندی) نے 1983 میں جو نصاب منظور کیا اس کے مطابق درجہ عالمیہ سال اول کے لئے اسی نوعیت کی کتب کے نام متعین طور پر دیئے گئے۔ کتب کی تعداد اس طرح ہے: ردِّ رفض 09 کتب، ردِّ بدعات (بریلوی)، 19 کتب، ردِّ جماعت اسلامی 03 کتب، ردِّ اہلحدیث 10 کتب، اسی طرح دیگر مسالک بھی حسب ضرورت غیر اعلان شدہ کتب پڑھاتے ہیں۔ یہ کتب درس نظامی کی امتحانی ضرورت کے لئے نہیں ہوتیں البتہ ذہن سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔''۱۹؎

مسلکی مطالعات کی اس طویل فہرست نے وقت کے تقاضوں اور چیلنج سے اہل مدرسہ کی نظر ہٹا دی ہے۔ سائنسی علوم کی مبادیات تو معلوم ہونا چاہئیں، جو آج کے الحادی فکر کی اصل بنیاد ہیں، لیکن مدارس کے لوگ اس کے قائل نہیں ہوتے نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ یہ میدان ہی دوسرا ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اہل مدرسہ کو علوم معاشرت کی طرف بھی متوجہ کیا تھا جو مدرسے کا حقیقی میدانِ کار ہے:

'' اہل علم اور علماء کرام کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغربی علوم وفنون کا تنقیدی انداز میں مطالعہ کریں۔ ان کے پانچ علوم ایسے ہیں جو اس وقت سب سے زیادہ غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں۔ جتنا کفر والحاد اس دور میں پھیلا ہے، وہ انہیں پانچ علوم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ (۱) علم نفسیات، (۲) علم بشریات ، (۳) علم عمرانیات، (۴) علم سیاسیات، (۵) علم معاشیات۔ علماء کرام کو ان علوم کا مطالعہ کر کے ان میں موجود غلط اساسات وتصورات کی تردید عقلی انداز میں دلائل وشواہد

کے ساتھ کرنی چاہیے۔''۲۰؎

وہ صاحبانِ علم دین، جنہوں نے دینی علوم میں درک اور عالمی پہچان حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دنیا دیکھ رکھی ہے، اہل مدرسہ کی توجہ اہم مسائل کی طرف کرواتے ہیں لیکن یہاں ''مناظرہ'' اور ''ذہن سازی'' اور ''دلائل کا توڑ'' وقت کے چیلنجز سے مقابلے کے لئے (جیسا کہ غزالیؒ اور رازیؒ نے اپنے وقت میں کیا) مسلکی برتری کے لئے ہے۔ جن موضوعات پر ڈاکٹر غازی صاحب نے توجہ دلائی، معاشرے کے بنیادی سوالات آج وہیں سے اٹھ رہے ہیں۔ مطالعے کی محدودیت کی وجہ سے مدارس کی فارغ التحصیل خواتین، جدید تعلیم یافتہ خواتین کے نہ تو سوال سمجھ پاتی ہیں، نہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہوتی ہیں۔

عقلی استدلال نہ کہ جبر

اسلام کی تعلیمات انتہائی معقولیت پر مبنی ہیں۔ علماء نے ایک عمومی قاعدہ مقرر کیا ہے کہ نقل صحیح عقل صریح کی مخالفت نہیں کرتی۔ قرآن مجید نے بھی دلائل کے لئے استقراء کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ ہر ایک کو نظر آنے والی عمومی اشیاء کی مثالوں سے مجرو عقائد اور مابعد الطبعیات پر استدلال کیا گیا ہے مثلاً زمین، آسمان، بادل، بارش اور ہوائیں، اور ان عام مشاہدات پر غور و فکر سے توحید اور آخرت کا اثبات۔ شاہ ولی اللہ کے مطابق اس طریقے سے قرآن مجید انسانیت کے ہر طبقے اور ہر دور کے لئے آسان اور قابل فہم ہو گیا۔۲۱؎ (**ولقد یسرنا القران للذکر فھل من مدکر**)۲۲؎

ہمارے عمومی تعلیمی نظام میں بچوں کو ضروری دینی معلومات مہیا کرنے کا مناسب اور موثر انتظام موجود نہیں ہے۔ دوسری طرف انہیں بچوں پر پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کی یلغار ہے۔ انہیں عالمی سطح پر جاری فکری اور عام طور پر اسلام مخالف مباحث تک رسائی حاصل ہے۔ اس پر مستزاد مادیت پرستی اور افادیت پرستی (materialism&utilitarianism) کے رجحانات، جو غبار کی طرح ہر شخص کو متاثر کر رہے ہیں۔ اس صورتحال میں نئی نسل کو واجبات دین کی ادائیگی پر قائل کرنے کے لئے بھی غیر معمولی ذہنی مشق درکار ہے۔ قرآن مجید میں یہ انداز اختیار کر کے احکام دینیہ کی کئی جگہ حکمتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ مثلاً نماز کی حکمت یوں بتائی:

ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر۲۳؎

تقسیم دولت کی حکمت یہ بیان فرمائی:

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۲۴؎

حج کے بارے میں فرمایا:

یشھدوا منافع لھم ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات۲۵؎

مدارس کے نظام تعلیم میں ''نقل'' اور دلائل نقلیہ'' پر زور ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل خواتین عوام الناس میں دلائل نقلیہ کے ساتھ آتی ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث نبویہ کو دور حاضر پر منطبق کرنے، عام لوگوں کے ذہن میں اتارنے اور جدید جاہلیت کو جدید طریقے سے رد کرنے کے حوالے سے عام طور پر کافی معلومات نہیں رکھتیں۔ نتیجہ عوام الناس اور خاص طور پر تعلیم یافتہ نوجوان نسل ان تبلیغی اور اصلاحی سرگرمیوں سے دور رہتی ہے جہاں محض ''جبر'' کی تعلیمات ہیں۔ انسانی ضروریات، اس کی نفسیات، اس کے زمانے اور دنیاوی حکمتوں سے جس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

دینی گنجائشیں

فتویٰ بڑا نازک میدان ہے۔ ایک عام آدمی بھی اس کا احساس رکھتا ہے یہی وجہ ہے لوگ بڑے معاملات (نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ) میں شہر کے بڑے علمی مراکز سے رجوع کرتے ہیں۔ دینی تعلیم یافتہ خواتین سے دروسِ قرآن اور فہم قرآن کلاسوں میں خواتین بڑے مسائل نہیں، عمومی معاملات کے بارے میں استفسارات کرتی ہیں۔ زیادہ تر یہ سوالات نماز، روزہ، زکوٰۃ، معاشرتی معاملات مثلاً لباس، تقریبات وغیرہ، اسی طرح پردہ، مشترکہ خاندانی نظام، تعدّد ازدواج اور آرائش و زیبائش وغیرہ کے بارے میں ہوتے ہیں۔

شریعت اسلامی کا عمومی معاملہ یہ ہے کہ عقائد و عبادات میں تو کسی اضافے کی گنجائش نہیں دی گئی لیکن معاملاتِ زندگی کے میدان کو وسیع رکھا گیا ہے۔ حکمتِ تشریع کے اہم اصولوں میں عدم، قلت تکلیف،

تدریج اور یسر قابل ذکر ہیں۔عرف وعادت اگر مقاصد شریعت سے نہیں ٹکراتی اور باہمی تعاون کے مقصد کو پورا کرتی ہے تو اس کی رعایت کی گئی ہے۔ اسی طرح احکام کے درجات ہیں۔فرض، واجب، مستحب،مباح اور مکروہ۔ یوں ایک عام معاشرتی معاملے میں کسی استفسار کا جواب دینے کے لیے بہت سے امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہے ۲۶۔شاہ ولی اللہ اسے"حکمتِ عملی" یعنی معاملات کی سوجھ بوجھ اور فہم سے تعبیر کرتے ہیں۔۲۷۔

اس سلسلے کے بعد مشاہدات بڑے تلخ تھے۔استیذ ان کے احکام بتاتے ہوئے،ایک مشہور مدرسے کی فارغ التحصیل معلمہ نے اسلام کے اس سیدھے سادے حکم کو ایسا''ہفت خواں'' بنا کر پیش کیا کہ ساری مجلس مبہوت تھی کہ اس حکم پر بھلا عمل کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔اسی طرح قرآنی کلاس کے اختتام پر جب سوالات شروع ہوئے تو بعض مباح امور کو مدرسہ نے بلا تکلف حرام قرار دے دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے مطابق نبی کریمؐ کے سامنے جب کوئی معاملہ آتا تو آپ اس کے آسان پہلو کو ترجیح دیا کرتے تھے ۔۲۸۔ عصر حاضر کے مشہور فقیہ علامہ یوسف القرضاوی اپنی مشہور کتاب''فی فقہ الاولویات''(جس کا ترجمہ''دین میں ترجیحات'' کے نام سے کیا گیا ہے۔) میں لکھتے ہیں کہ مفتی کو کسی معاملے میں''احوط'' یعنی زیادہ مبنی بر احتیاط لیکن مشکل معاملے کی بجائے''ایسر'' یعنی زیادہ سہولت والے معاملے پر فتویٰ دینا چاہیے۲۹۔معاشرتی میدان میں اہل دین کے سخت فتاویٰ نے یہ ماحول پیدا کر رکھا ہے کہ لوگ استفسار کی جرأت ہی نہیں کرتے کہ''مولوی'' سب کچھ منع کر دیں گے۔ یوں ایک عالم کے الفاظ میں گناہ جانتے ہوئے ایک کام کرتے رہنے سے یہ صفت نفسیات کا حصہ بننے لگتی ہے اور دیگر گناہ بھی آسان ہوجاتے ہیں۔۳۰۔

فن اور ہنر کی تعلیم

اسلامی تاریخ میں مدارس کی یہ روایت رہی کہ علوم دینیہ کے ساتھ فن اور ہنر کی تعلیم بھی دی جاتی تھی تاکہ طلبہ عملی زندگی میں آزادانہ معاش کا انتظام کر سکیں۔طب، کتابت،جلد سازی،گھڑی سازی وغیرہ کی تعلیم ہندوستان کے مدارس میں بھی عام تھی ۔ معاش کی آزادی اور فراخی، عامتہ الناس سے مالی معاملات میں ایک درجہ استغناء اور بے نیازی ایک صاحب علم کو وقار اور جرأت عطا کرتی ہے۔

طالبات کے مدارس میں اس حوالے سے اچھی خاصی غفلت نظر آتی ہے۔ایک صدر معلمہ نے بتایا کہ انہوں نے عام گھرداری کے،(ہنر مندی نہیں) مثلاً کچھ کھانے بنانا اور ابتدائی سلائی کے کچھ اسباق ٹائم ٹیبل میں رکھے ہیں لیکن''جان پر کھیل کر'' کیونکہ وقت ہی نہیں ہوتا ان کاموں کے لئے۔''سوال یہ ہے کہ میٹرک کے بعد ایک طالبہ اگر چار سال کے لیے اقامتی مدرسے میں آئے،اس کی سالانہ چھٹیاں بھی مختصر ہوں،اور یہاں وہ بنیادی گھرداری بھی مشکل سیکھ پائے،تو اپنی مستقبل کی گھریلو زندگی، یا اگر معاشی ضروریات آن پڑیں،تو ان تقاضوں کو کس طرح نبھا سکے گی؟ مدارس کی اساتذہ سے جو سروے کیا گیا،اس میں پوچھا گیا کہ طالبات کو معاشی ضرورت اگر پیش آجائے تو کیا کرتی ہیں۔95فیصد جواب آیا کہ مدارس بناتی ہیں،یا مدرسے سے تدریس سے وابستہ ہوجاتی ہیں،یا پھر رضا کارانہ تدریس کرتی ہیں۔

یہ ہزاروں طالبات مدارس میں ہی نہیں کھپ جاتیں۔مدارس کی 80یا90فیصد طالبات اگر کم آمدنی کے طبقے سے آتی ہیں،اپنا خرچ بھی برداشت نہیں کر پاتیں تو ظاہر ہے لوٹ کر بھی وہیں جاتی ہیں۔کم آمدنی والے طبقات میں اگر یہ خواتین صرف درس کے ساتھ ہنر سکھانے والی بھی ہوں تو اپنے گردوپیش کے لئے زیادہ بابرکت ثابت ہوں گی۔ افریقی ممالک،جہاں مسیحیت نے تیزی سے قدم بڑھائے،اور جو مغربی یونیورسٹیوں میں تحقیق کا مستقل موضوع ہے،وہاں مشنری کام کرنے والوں نے اس کا اہتمام کیا۳۱۔ایک تبشیر پادری سے ملاقات کرنے والا اس کو ڈھونڈتا ہوا پہنچا تو وہ گاڑی کے نیچے گھسا اپنے شاگرد کو کام سکھا رہا تھا۔طریقہ کار یہ تھا کہ وہ بچوں کو مکینک کا کام سکھاتا،تبلیغ کرتا اور عیسائی بناتا۔اس کے بعد ورکشاپ کھولنے کے پیسے دے کر اگلے گاؤں کا رخ کرتا۔

ہمارے مدارس میں زیر تعلیم طالبات کتنے ہی ہنر سیکھ کر، اپنے گھروں کو ان کا مرکز بنا سکتی ہیں۔ کم پیسوں میں، مشنری جذبے کے ساتھ سکھائیں تو عام آبادی کا ان کی طرف رجوع بڑھے گا۔ لوگ دین بھی سیکھیں گے اور دنیاوی فائدے بھی پائیں گے۔ یہی میدان دین بے زار این جی اوز نے سنبھال رکھے ہیں۔ **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** ۳۲۔ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے آج سے عشروں پہلے خواتین کے لئے جو کتاب ''بہشتی زیور'' لکھی، اس میں گھریلو ہی نہیں، تجارتی پیمانے پر بھی بعض اشیائے ضرورت بنانے کے طریقے سکھائے۔ حساب کتاب لکھنے کے اسباق شامل کیے اور گھر داری، سلیقے اور اہل خانہ کا خیال رکھنے کے حوالے سے پوری تربیت کا اہتمام کیا۔

حالاتِ حاضرہ سے بے خبری

دنیا آج عالمی گاؤں (global village) کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ایک تو خبر سرعت سے پھیلتی ہے کہ میڈیا طاقتور اور تیز رفتار ہے، دوسرے دنیا کے کسی گوشے میں پیش آنے والا مسئلہ یہ واقعہ پوری دنیا کو فکری اور عملی طور پر متاثر کرتا ہے۔ معاملہ یہ بھی ہے کہ میڈیا کی یہ طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، اس لئے عام طور پر ایسے اثرات مسلمانوں کے حق میں نہیں ہوتے۔

ادھر ہمارے مدارس دینیہ کی عمومی صورت حال یہ ہے کہ اخبار پڑھنا وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔ خبروں کے دیگر ذرائع مثلاً ٹی وی اور انٹرنیٹ وغیرہ تک عام طور پر طالبات کو رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ مدرسے کی محدود چار دیواری کے اندر دیکھا جائے تو بچیاں گو مطمئن نظر آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر ہوتی ہیں۔ خواتین اساتذہ بھی عام طور پر مدرسے میں قیام پذیر ہوتی ہیں، اور اسی ماحول کا حصہ، چنانچہ ان کا حال بھی وہی ہے۔ احوال عالم سے دلچسپی پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ تاریخ اور جغرافیہ ہو سکتا ہے لیکن یہ ہمارے مدارس دینیہ کے نصاب کا حصہ نہیں ہے۔ کہیں اگر تاریخ اسلام شامل نصاب ہے بھی تو عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ سے آگے نہیں جاتی، جبکہ آج کے مسائل وہ ہیں جو ہماری تاریخ سے بھی جڑے ہیں اور جغرافیے سے بھی۔ برصغیر کی تاریخ معلوم نہ ہو تو کشمیر اور برما کے مسائل سمجھے نہیں جا سکتے۔ یہودیت کی تاریخ معلوم نہ ہو تو فلسطین کا مسئلہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ کروسیڈز کی تاریخ معلوم نہیں تو کسی کو کیا پتہ کہ عراق جنگ میں اتحادی افواج کے سرخیل، امریکی صدر کی زبان سے یہ لفظ کیوں پھسلا۔ قیام پاکستان کے مقاصد، تاریخ اور پس منظر کا پتہ نہ ہو تو موجودہ حالات کا گلہ بنتا ہی نہیں۔ مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کے الگ ہونے میں تبشیری سرگرمیوں کا بھی کردار تھا، اگرچہ عالمی طاقتوں کی سرپرستی میں یہ مسلم ممالک دولخت ہوئے۔ دینی تعلیم کے وہ ادارے، تبلیغی سرگرمیاں جن کے اہداف و مقاصد میں سرفہرست ہیں، اپنے طلبہ و طالبات کی ان احوال عالم سے بے خبری کا کیا جواز پیش کر سکتے ہیں؟ یونیورسٹیوں میں ایم فل کے داخلے کے لئے آنے والی ایک طالبہ سے جو ایک مشہور دینی مدرسے سے ''عالمہ'' کی تازہ سند لائی تھیں اور ایم اے کا جزوی امتحان بھی پاس کر چکی تھیں، پوچھا گیا کہ ''شام'' میں کیا ہو رہا ہے؟ شام وہ مسئلہ ہے جس پر دنیا چیخ پڑی ہے، لیکن طالبہ کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ آسان سوال پوچھا کہ اس دفعہ منیٰ میں کیا حادثہ ہوا ہے۔ وہ اس سے بھی بے خبر تھیں۔

احوال عالم سے یہ بے خبری اچھی خاصی بے حسی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ ڈھونڈیں تو بلا شبہ وہ نصاب میں بھی ملتی ہے۔ یونیورسٹیوں کے ایم اے اسلامیات کے نصاب سے رہنمائی لی جا سکتی ہے جہاں عالم اسلام کے وسائل و مسائل کے نام سے ایک مضمون موجود ہے۔ ''تاریخ اسلام'' مکمل نصاب کا حصہ ہے۔ اسی طرح جدید فکری چیلنج، نصاب کا اہم حصہ ہونے چاہئیں۔ خواتین کے مدارس میں حقوق نسواں کے مغربی تصورات کا تقابلی مطالعہ کروایا جا سکتا ہے۔ مغربی لادینی تصور پر مبنی حقوق نسواں کی تنظیموں کے یہ ایجنڈے آج اقوام متحدہ کے اگلے ہزار یے کے اہداف میں شامل ہیں۔ سارے مسلم ممالک کے ساتھ پاکستان بھی ان پر عمل درآمد کا پابند ہے ۳۳۔ اس کنونشن پر دستخط کرنے کے بعد سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی طالبات کو مدارس کے

''جزیروں'' تک محدود رکھ کر کوئی بڑے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ جس دنیا میں انہیں نکلنا اور کام کرنا ہے، اس کی درست معلومات بروقت ان تک پہنچانے کا اہتمام ضروری ہے۔

طرزِ تدریس

کوئی شعبہ علم بجائے خود کتنا ہی اہم اور نافع کیوں نہ ہو، موثر تدریس کے بغیر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ صدیوں کے تدریسی تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے اس حوالے سے آج جو تحقیقات و نظریات پیش کئے جا رہے ہیں، اور جن کی روشنی میں تعلیمی و تدریسی عمل میں انقلابی تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں، ان میں سے اکثر کی افادیت مسلم ہے۔ وہ مدرس، جو تھوڑا سا بھی ذوق وشوق رکھتا ہو، ان مہارتوں کو سیکھنا اور استعمال کرنا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے، البتہ اس معاملے کی اہمیت تسلیم کرنا ضروری ہے۔

خواتین کے مدارس کی انتظامیہ اور اساتذہ سے جو معلومات حاصل کی گئیں ان کے مطابق تدریسی معاونت کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ عام طور پر بیانیہ تدریس ہے۔ (۸۵ فیصد تک) صرف پندرہ فیصد نے بتایا کہ وہ کلاس میں بورڈ اور مارکر استعمال کرتے ہیں۔ صرف دس فیصد نے آڈیو ویڈیو معاونات کی بات بھی کی۔ رجسٹرڈ مدارس کو جب سے کمپیوٹر ملنے لگے ہیں، ان کا تھوڑا بہت رجحان اس طرف ہوا ہے لیکن طلبہ کے مدارس کی نسبت طالبات کے ہاں ابھی بھی اس حوالے سے بہت توجہ نہیں ہے۔ کہیں کہیں کلاس میں بحث ومباحثہ کی اجازت دی جاتی ہے لیکن ''حدوں کے اندر'' قابل توجہ بات یہ ہے کہ ۷۵ فیصد اساتذہ اپنی تدریس سے مطمئن تھیں۔ صرف ۲۵ فیصد نے اظہار کیا کہ وہ کسی تدریسی ورکشاپ یا اساتذہ کی تربیت کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔

درحقیقت دینی مدارس میں اساتذہ کے اس رویئے کو ایک اور جہت سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ سرکار کے ہاں تو پرائمری سکولوں میں بھی اساتذہ کی تقرری کے وقت کسی پیشہ ورانہ ڈگری کی ضرورت ہے، لیکن دینی مدارس میں اساتذہ یا تو مدرسے کے منتظمین کے خاندان کی ارکان ہوتی ہیں (بہنیں، بیویاں، بیٹیاں وغیرہ) یا قریبی تعلق کے واسطے سے تدریسی ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہیں۔ ایسی اساتذہ کی تقرری میں اہلیت اور میرٹ کا کوئی تصور عام طور پر موجود نہیں ہے۔ تدریس کا بنیادی تصور بھی بس اتنا ہے کہ کتاب کا متن پڑھانا اور ''سبق'' یاد کروانا ہے۔ ''اتنی سی تدریس'' کے لئے اہل مدرسہ بہت توجہ اور اہتمام (bother) بھی نہیں کرتے۔ چونکہ استاد بننے کے لئے کوئی مقابلہ نہیں ہے، اس لئے اساتذہ کو بھی نہ مدرسہ بننے سے قبل، نہ دورانِ تدریس کسی تربیت یا اپنے کام کو بہتر بنانے کا خیال آتا ہے نہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اس ساری صورت حال میں یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ کسی بھی فن کی تحقیق، تفہیم، تجزیہ اور اطلاق، اخذ نتائج اور گزشتہ تعلیمی تجربے کی روشنی میں آئندہ اس عمل کو بہتر بنانے کی کوششیں اگر ''جدید تعلیمی عمل'' کا حصہ ہیں تو ان کے قبول کرنے میں کون سی قباحت ہے؟ دینی تعلیم میں سب کچھ وہ شامل ہے جس کا عملی زندگی میں اطلاق ہوتا ہے۔ اگر طالبات کو اس حوالے سے عملی سرگرمیوں میں مشغول کیا جائے، معاشرتی رجحانات کا ان سے تجزیہ کروایا جائے اور بدلتی صورت حال میں اصولِ دین کو قائم کرنے کے حوالے سے رہنمائی دی جائے تو وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد معاشرے کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں گی بہ نسبت ان طالبات کے، جو صرف ونحو میں تو بڑی ماہر ہوں، لیکن عملی معاملات کی سوجھ بوجھ میں بہت پیچھے۔ عامۃ الناس کو دین کا پیغام اس کی اصل روح کے ساتھ پہنچانا انہیں ''عالمات'' کے لئے ممکن ہے جنہیں روح دین سکھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ صرف ''علوم آلیہ'' کی واقفیت معاشرے کی ضرورت کو پورا نہیں کرتی، خاص طور پر حلقہ نسواں میں ۳۴۔ سروے کے نتائج کے مطابق فہم قرآن مجید کی کلاسوں کی مستقل شرکاء میں سے صرف آٹھ فیصد خواتین عربی گرامر سیکھنا چاہتی تھیں، باقی بانوے فیصد اس بات کو کافی سمجھتی ہیں کہ انہیں قرآن وحدیث کا پیغام سمجھ آ جائے۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس جدید تعلیمی اسلوب کی ساری مفید ''مہارتیں'' نبی کریمؐ کے اسوۂ تعلیمی میں جا بجا ملتی ہیں۔ اگر اہل مدرسہ

جدید ماہرین تدریس کے سامنے نہیں تو مدرسۂ نبوت کے سامنے ہی زانوئے تلمذ تہ کرلیں۔ نبی کریمؐ نے تدریس کو مشن سمجھا اور اس راہ میں اپنی ساری توانائیاں صرف کیں۔ عام فہم مثالیں دے کر دین سے بالکل ناآشنا عربوں کو علوم دین و دنیا میں امام بنایا۔ پانچ نمازوں سے گناہ دور ہونے کی مثال پانچ بارندی میں نہانے سے دی، ۳۵۔ ایک ہاتھ کی دو انگلیوں کو جوڑ کر جنت میں اپنی معیت کی خوشخبری کی ''محسوس'' مثال دی ۳۶۔ زمین پر ایک مربع بنا کر اور کچھ خط مربع سے باہر کھینچ کر سمجھایا کہ یہ زندگی ہے انسان کی، اور یہ باہر نکلتے خط اس کی امیدیں ہیں جو حد زندگی سے باہر نکل پڑتی ہیں۔ ۳۷۔ نبی کریمؐ نے اپنے طلبہ کے سامنے اپنا مثالی کردار پیش فرمایا، رسوخ فی العلم کی اہمیت کو اجاگر کیا، ان سے پر خلوص محبت کے ذریعے انہیں اس راستے کا راہی بنایا جو انبیاء کرام علیہم السلام کا مشن تھا۔ انہیں بلند مقاصد اور بڑے اہداف دیئے اور حکمت کے ساتھ ان کے حصول کی کوشش کرنا سکھایا۔ ''فیضانِ نظر اور مکتب کی کرامت''، دونوں کو جمع کیا اور دینی و دنیاوی اعتبار سے وہ بہتر نتائج پیدا کئے جن کا اعتراف دشمنوں نے بھی کیا۔

نصیب مدرسہ یارب یہ آبِ آتش ناک!

عملی اقدامات کی ضرورت

مدارس کے کردار کی بہتری کے حوالے سے تحقیق، مطالعات، مشاہدات اور تجاویز کی کمی نہیں ہے۔ حکومتی بھی، اور ہمدردان مدرسہ کی سطح پر بھی اس حوالے سے اہل مدرسہ کے ساتھ تعاون کے لئے لوگ تیار ہیں۔ اہل علم انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں ۳۸۔ اس حوالے سے تو ان کی معاشرتی ذمہ داریاں بڑی وسیع ہیں ہی، لیکن پاکستان کے تناظر میں اس لئے بھی یہ معاملہ اہم ہے کہ مدرسے کی مالی ضروریات مکمل طور پر ہمارا معاشرہ ہی پوری کرتا ہے۔

نبی کریمؐ نے فرمایا تھا ''اس دین کا پیغام ہر کچے اور پکے گھر میں پہنچے گا۔ جہاں دن اور رات پہنچتے ہیں۔'' ۳۹۔ یوں تو آپؐ نے پوری امت کو اس کا ذمہ دار بنایا تھا لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آج اس دین کی اجنبیت میں اہل مدرسہ کا کردار کتنا ہے؟ اس دین کی ساری خیر اور سارے منافع، خیر القرون ہی کے لئے مخصوص نہیں تھے۔ جس دور تاریخ اور جس زمانے کے انسان اس پر عمل اور اس کے نفاذ کی مطلوب کوششیں کریں گے، ہر اس دور اور زمانے کو اس کی برکات حاصل ہوں گی، نبی محترمؐ کے فرمان کے مطابق ''میری امت کی مثال باران رحمت کی سی ہے، نہیں معلوم کہ اس کے اول میں خیر ہے یا آخر میں'' ۴۰۔ اس دور فتن میں جو معاشرہ مدارس کی مالی ضروریات خوش دلی سے پوری کر رہا ہے، وہ اہل دین کی تعلیم پر بھی کان دھر سکتا ہے اگر داعی نمونہ عمل بنیں اور دین کی دعوت اخلاص، محبت اور حکمت کے ساتھ ان کے دلوں میں جاگزیں کرنے کے لئے اپنے اندر فکرمندی پیدا کریں۔ طبقۂ نسواں اس تبدیلی کی تمہید ہوسکتا ہے۔

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
تیرا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

☆......☆......☆

مصادر و مراجع

19۔ دینی مدارس میں تعلیم۔ ص ۲۲۸، ۲۲۹

20۔ اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ص ۱۱۵، پاکستان اسلامک ایجوکیشنل کانگرس۔ ۲۰۰۱ء

21۔ الفوز الکبیر، شاہ ولی اللہ، ص ۴۳، ۴۴، قرآن محل، مولوی مسافر خانہ، کراچی، ۱۹۸۲ء

22۔ القمر ۳۲:۵۴

23۔ العنکبوت ۳۵:۲۹

24۔ الحشر ۷:۵۹

25۔ الحج ۲۸:۲۲

26۔ محاضرات فقہ، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ص ۶۶ تا ۷۰ الفیصل ناشران کتاب، اردو بازار، لاہور

27۔ انفاس العارفین، شاہ ولی اللہ، ص ۸۳، شاہ ولی اللہ اکیڈمی۔ حیدر آباد، سندھ ۱۹۶۶ء

28۔ صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل، کتاب الادب، حدیث نمبر

٦١٦٢،دارالسلام للنشر والتوزیع،ریاض،١٩٩٩ء
29۔ دین میں ترجیحات ، یوسف القرضاوی ،ص ٢٣، ادارہ منشورات،منصورہ،ملتان روڈ،لاہور۔٢٠٠٨ء
30۔تفہیم القرآن،سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ،١/١٤٥،ادارہ ترجمان القرآن،لاہور،١٩٩٤ء
31۔ ہمارااسلام قبول کرنا،پروفیسرخالدحامدی فلاحی،ص ٢٣٢، منشورات،ملتان روڈ،لاہور۔٢٠٠٩ء
32۔الرعد ١٣:١٧
hht/www.unmillinniumproject.org/goals/gti.htm۔33
34۔التفہیمات الالٰہیہ،شاہ ولی اللہ،شاہ ولی اللہ اکیڈمی،حیدرآباد سندھ،١٩٦٦ء
35۔صحیح بخاری،کتاب مواقیت الصلاۃ،حدیث ٥٢٨
36۔صحیح مسلم ، کتاب البر و الصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات،حدیث ٢٦٣١،
37۔ ابن ماجہ، کتاب الزھد۔ باب الامل و الاجل ، حدیث ٤٢٣١:،دارالسلام للنشر واتوزیع،ریاض١٩٩٩ء
38۔الرمذی،کتاب العلم،باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ ، حدیث:٢٦٨٢،دارالسلام للنشر والتوزیع،ریاض١٩٩٩ء
39۔مسند احمد ، احمد بن حنبل ، حدیث ١٦٥٠٩،تمیم الداری ، ٥/٧٣،داراحیاءالتراث العربی،بیروت،١٩٩١ء
40۔الترمذی،باب مثل امتی مثل المطر ،حدیث ٢٨٦٩

☆......☆......☆

زندگی شرمندگی

جب ہوا پیشِ درِ والا نبیؐ
کچھ نہ تھا ہمراہ جز شرمندگی
اُس گھڑی میرا سہارا بن گئی
چشمِ نمدیدہ لبوں کی کپکپی

☆☆☆☆

یہ صدا آئی یہاں لائے ہو کیا
ناتواں ایمان، دل کی بے حسی
کیا ترے دل میں کوئی خواہش بھی ہے
آ گہی بس آ گہی بس آ گہی

☆☆☆☆

کیا کوئی مونس مرا دکھ سکھ میں ہے
شکر و ذکر و فکر و فقر و صابری
چاہتا ہوں میں مجھے عزت ملے
تم ذرا اپنا کے دیکھو عاجزی
ہم جدید افکار اپنا لیں تو کیا
کیا میری سنّت میں ہے کوئی کمی
جب کہا میں نے مسلماں کم نہیں
صاحب ایماں بھی ہے لاؤ کوئی
کام کیا آئیں گے میرے روزِ حشر
بس فقط اعمال ہی اعمال ہی
مختصر سی اک ہدایت چاہیے
امرِ باالمعروف عن المنکر نہی
میں یہاں سے جاؤں تو لے جاؤں کیا
میرا دیں ہے روشنی ہی روشنی

رات دن بے چین سا رہتا ہے دل
دوسروں کے درد میں ڈھونڈو خوشی
کیوں جہاں بھر میں پذیرائی نہیں
جب بھی تم نے فکر کی اپنی ہی کی

☆☆☆☆

یوں تو کہتے ہو کہ ہم ہیں آپ کے
میری خاطر کوئی قربانی بھی دی
صرف باتیں ہیں کہ دیوانے ہیں ہم
میری خاطر بھی کوئی دیوانگی
میری سنّت کا یہی اعجاز ہے
جھکنے والے کو ملی ہے سروری
جسم و جان و روح آلودہ نہ ہوں
میرا دیں ہے طاہری ہی طاہری
کوئی ادنیٰ اور کوئی اعلیٰ نہیں
صرف تقویٰ ہے نشانِ برتری
چاہتے ہو امتیازِ نیک و بد
اور یہ خواہش ملے شاہنشہی
صرف دنیا پر نہیں موقوف کچھ
چاند تارے بھی کریں گے چاکری
جو مرے اصحاب نے اپنائی تھی
تم بھی اپنالو وہی شستہ روی
چاہتے ہو گر شفاعت روزِ حشر
بات چھوٹی ہے مگر ہے جامعی
زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

حبیب الرحمن

غزلیہ

چمکتے دِن میں ہوں یا میں شبِ سیاہ میں ہوں
میں مدّتوں سے تری ہمرہی کی چاہ میں ہوں
نہ ڈوبنے کا کوئی غم، نہ حسرتِ منزل
عجب سُرور میں ہوں کہ تری نگاہ میں ہوں
نہ دشمنوں کا کوئی ڈر، نہ دوستوں کی طلب
حصارِ شوق میں ہوں درد کی پناہ میں ہوں
سمجھ رہے تھے کہ بخشش نہ مِل سکے گی مجھے
وہ جانتے ہی نہیں کِس کی بارگاہ میں ہوں

☆

جلوۂ حُسن کا کچھ ایسا میں دلدادہ ہوں
آپ ہی اپنی تباہی پہ میں آمادہ ہوں
نہ ہے وہ شانِ کلیمی نہ حضوری کا ادب
اُس پہ یہ شوقِ طلب، دل کا بہت سادہ ہوں
اپنی دُھن میں جو چلے تیری لگن دل میں لیے
منزلِ عشق کہے دور ہوں اُفتادہ ہوں
روح بیتاب ہے پرواز کو مولا ! دھو دے
دل پہ مدّت سے جو اِک بارِ ہوس لادا ہوں

آمنہ رُمیصا زاہدی

غزل

ذرّے کو آفتاب مت لکھنا
خاروخس کو گلاب مت لکھنا

مرحلے ہیں یہ آزمائش کے
سچ کو بھی بے حساب مت لکھنا

لکھتے رہنا ذرا ذرا سی خوشی
زندگی کے عذاب مت لکھنا

سب سے چھپ کے جسے جلانا پڑے
ایسے خط کا جواب مت لکھنا

کر کے پیری کے دکھ سے صرفِ نگاہ
صرف رنگِ شباب مت لکھنا

بے وفا موسموں کے آنچل پر
زندگی کا نصاب مت لکھنا

نجمہ یاسمین یوسف

غزل

دردِ جاں ہے ، دردِ دل ، دردِ جگر
زندگی گویا ہے خود اک دردِ سر

کون سا دکھ کم ، زیادہ کون سا
کیا بتائیں کس کو، سب ہیں بے خبر

زیرِ لب شکوہ ہو کیوں تقدیر کا
زندگی ہے مختصر سی رہ گذر

دن گذر جائیگا آخر ایک دن
رات کٹ جائیگی ، آئے گی سحر

دوش پر جیسے ہو آندھی کے دیا
زندگی اب ہورہی ہے یوں بسر

ان کی باتیں ، ان کا ذکر اچھا نہیں
اپنی باتیں کیا کریں ، ہے بے اثر

راہ دکھلائے گی دن کی روشنی
ظلمتِ شب دور ہو جائے اگر

ذکیہ فرحت

غزل

دولتِ رنج رائیگاں میری
پر یہ دولت بھی اب کہاں میری

میں بھی گردش میں وہ بھی گردش میں
نقل کرتا ہے آسماں میری

شام کو یہ شفق نہیں ہوتی
آنکھ ہوتی ہے خوں فشاں میری

رہنے والا ہوں اس خرابے کا
کون دیکھے گا خوبیاں میری

کتنے اُجلے ہیں رفتگاں کے نقوش
کتنی روشن ہے، کہکشاں میری

میرے وہم و گماں میں یہ کب تھا
ایسے اُجڑیں گی بستیاں میری

خوفِ بے مہریِ زمانہ سے
بزم انجم دھواں دھواں میری

یہ کرامتؔ ہے شعرونغمہ کی
بات پہنچی کہاں کہاں میری

کرامت بخاری

عافیہ رحمت

میں تیرے جمال کا عکس تھا

''امی یہ آپ کے پیار نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ آپ مارتی کیوں نہیں اسے۔''

ناصر اپنے چھوٹے بھائی یاسر سے بہت ہی نالاں تھا اور حسب معمول اس کی شکایت کر رہا تھا۔

''امی میرا دل چاہ رہا ہے میں اس کو اتنا ماروں، اتنا ماروں کہ اس کا سر ٹوٹ جائے۔'' ناصر بدستور غصے میں تھا۔

''بیٹے، ایسا تھوڑی کہتے ہیں، کیا ہوا جو اس نے تمہارے بلاکس گرا دیئے، تم پھر سے بنالو، اور تم اس کو پیار سے بھی منع کر سکتے تھے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''پیار کے قابل ہی نہیں ہے یہ، بہت بدتمیز ہے۔'' اب ناصر رونے لگ گیا تھا۔

''اچھا میں یاسر کو اپنے ساتھ گیم کھلا لیتی ہوں۔'' بادل نخواستہ میں نے اپنی کتاب بند کی تھوڑی دیر میں مدرسے جانے کا وقت ہو گیا اور ناصر اور یاسر دونوں مدرسے چلے گئے۔

☆......☆......☆

ناصر جتنا سمجھ دار اور سنجیدہ طبیعت تھا یاسر بالکل اس کا الٹ تھا۔ ہر وقت شور مچانا، مارنا دھاڑنا اس کے پسندیدہ کام تھے۔ بعض وقت تو میرا دماغ بالکل ہی سن ہو جاتا اور بس دل چاہتا کہ اب ڈنڈا اٹھاؤں اور لمحہ بھر میں فیصلہ کر ڈالوں مگر پھر بس یہ خیال ہی قدم روک لیتا کہ جتنی قدرت مجھے اس بچے پر ہے اس سے کہیں زیادہ قدرت رب کو میرے اوپر ہے۔ اور اگر وہ بھی میرا علاج اس طرح کرنا شروع کر دے تو شاید ہڈی پسلی بھی نہ بچے میری۔'' اف اللہ میری مدد فرما۔'' میں دعا کرتی ہوئی وضو کرتے چلدی۔

☆......☆......☆

بچوں کے مدرسے سے آنے سے پہلے میں نے آلو کے چپس اور سوجی کا حلوہ پکا کر رکھ دیا تھا کہ آتے ہی وہ پہلے کھا پی لیں پھر ہوم ورک کراؤں گی۔ ''اللہ جی! میری مدد کیجئے گا کہ مجھے مارنا نہ پڑے۔'' میں اللہ سے دل ہی دل میں مدد مانگ رہی تھی کہ اس کی مدد کے بغیر تو ایک قدم چلنا ممکن نہ تھا۔

بیل بجی......تو بجتی ہی چلی گئی پھر دروازے پر لاتیں پڑنی شروع ہو گئیں یا اللہ! یہ بچہ کب سدھرے گا۔ میں اپنا غصہ دبانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ گھر آتے ہی ٹوپی اچھال کر پنکھے پر پھینکی قاعدہ کونے میں رکھا اور لگا شور مچانے، دل تو چاہا خوب مار لگاؤں آئندہ یہ حرکت کرنا بھول جائے مگر پھر اس حدیث نے ہاتھ پکڑ لیے ''جتنا کچھ نرمی پہ عطا کیا جاتا ہے، سختی پر نہیں۔''

اب اس نے پنکھا چلایا اور ٹوپی نیچے آگری پھر وہ خوب ہنسا۔ میں نے چپس اور سوجی کا حلوہ پلیٹوں میں سجا لیا تھا اور گرما گرم خوشبو سب کو کھینچ رہی تھی۔

''یاسر آپ پہلے اپنی ٹوپی دھو کر آئیں گندی ہو رہی ہے، میں نے آپ کا حصہ الگ کر دیا ہے۔'' وہ خاموشی سے ٹوپی اٹھا کر دھونے چلا گیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ ٹوپی کو دھو کر وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''امی ٹوپی بہت صاف اور چمکدار ہو گئی ہے۔''

''واقعی، تم نے اتنی اچھی طرح دھویا۔'' میں نے اس کو گالوں پر پیار کیا۔ وہ کھانے میں مگن ہو گیا۔

مغرب کی اذان ہوئی میں نے جائے نماز بچھائی تو ساتھ خود اپنی

جائے نماز بھی بچھالی۔

''امی آج میں بھی نماز پڑھوں گا۔''

میں نے خوش ہو کر کہا۔''واقعی ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

دل ہی دل میں اطمینان سے اپنی نماز ادا کرنے پر اللہ پاک کا شکر یہ ادا کر رہی تھی۔ ورنہ تو کبھی کبھار نیت توڑ کر ناصر کو سمجھانا پڑتا یا پھر یاسر کو مارنے سے روکنا پڑتا تھا۔

نماز پڑھنے کے بعد میں نے اس کو گلے لگایا اور دونوں گالوں پر پیار کیا۔ بے چارہ ابھی صرف چھ سال کا ہی تو ہے۔ دل میں سوچا۔ میں زور زور سے دعا کرنے لگی''اللہ تعالی یاسر کو بہت اچھا، بہت پیارا اپنا بندہ بنالے۔سب کی بات ماننے والا، اچھے کام کرنے والا۔''اور آمین کرنے کے بعد میں اٹھ گئی۔

''امی میں آپ کی جائے نماز بھی تہہ کر دوں گا آپ چھوڑ دیں۔''

وہ بہت خوش اور مطمئن لگ رہا تھا۔ جائے نماز رکھ کر آنے پر میں نے دیکھا وہ بہت پرسکون لگ رہا تھا۔

''امی میں بہت اچھا بچہ ہوں ناں !'' وہ آہستہ آہستہ میری گود میں آبیٹھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں یاسر تو بے حد اچھا بچہ ہے۔''میں نے اس کے بال سہلائے۔

''امی پتہ ہے میں جب 10 سال کا ہوں گا تو میں کیا کروں گا؟''

''جہاز اڑاؤ گے۔شوں،شوں۔''

میں نے اس کی خواہش کے مطابق کہا۔

''نہیں امی میں حافظِ قرآن بنوں گا۔ کیونکہ مجھے جنت میں جانا ہے۔''

وہ بہت اطمینان سے کہہ رہا تھا اور میں حیران ہو رہی تھی پھر کہنے لگا۔

''امی پھر میں بہت اچھا بچہ بن جاؤں گا تو آپ ہر روز مجھے پیار کریں گی ناں۔''

میں نے پھر سے اس کو پیار کیا۔''ضرور بیٹا کیوں نہیں۔''

اور پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے میں نے غور کیا کہ واقعی میں نے کافی دنوں سے اپنے چھ سالہ بیٹے کو پیار سے دیکھا ہی نہیں، پیار کرنا تو دور کی بات......!!

☆......☆......☆

حاجرہ ریحان

ڈھائی منٹ

'ہمارے کنے تو ہر مسئلے کے دو ہی سالوشن ہوتے ہیں استانی جی.....'

اُس نے پان بھرے منہ سے بھاری آواز میں بتایا اور ساتھ کے ساتھ دو چھوٹے سائز کی شیشے کی بوتلیں جیب سے نکال کر میری آنکھوں کے آگے لہرانی شروع کر دیں۔

''اب میں تنے اکسپیریمنٹ کر کے دکھاتا ہوں......ایسے ہی تو بچے سیکھے ہیں......کیوں......؟''

اُس نے بھونڈے پن سے اپنے دو ساتھیوں کی طرف پلٹ کر دیکھا تو وہ سر ہلانے لگے۔ ان دونوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر میرے ایک جوتے کو اپنے جوتے کی نوک سے سرکا کر آگے بڑھا کر ''باس'' کے قریب کر دیا۔ میری عادت تھی کہ میں کلاس میں جاتے ہی اپنی چپل، سینڈل یا جوتے جو بھی میرے پیر میں ہوتا میز کے نیچے اتار کر کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی تھی اور اپنے اسٹوڈنٹس کو بھی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ چاہیں تو ایسا ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ شروع میں میری دیکھا دیکھی اکثر بچے جوتے موزے اتار کر کرسی کے نیچے کھسکا کر کرسی پر چڑھ بیٹھتے تھے مگر پھر میرا پیریڈ ختم ہونے پر ان کو دوبارہ سے جوتے موزے پہننے پڑتے اور اس وجہ سے میرے بعد آنے والی ٹیچر کی ناراضگی کی بنا پر تھوڑے ہی دنوں میں سب ویسے ہی ٹھسے بیٹھے رہتے اور میں مزے میں کرسی پر چڑھی ان کو لیکچر دیتی رہتی تھی۔ لہٰذا اُس کے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اچانک یوں نمودار ہونے پر میں گھبرا کر جو کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف لپکی تھی تو جوتے میں پیر ڈالنا بھول ہی گئی تھی۔

اُس نے ایک بوتل کا منہ کھولا اور اُس میں سے اڑتی باہر لپکتی بھاپ کو دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا شے ہے۔ اس نے میرے جوتے پر بوتل کو خالی کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرا جوتا کسی مکڑی کے جالے کی طرح جس پر پانی پھینکا جائے سمٹ گیا۔ تیزاب اتنا تیز تھا کہ جوتے کو لئے کھردرے فرش کے اندر تک دھنس گیا۔ اسی اثناء میں میرا دوسرا جوتا بھی حاضر کر دیا گیا۔ اس نے دوسری بوتل کھول کر اس پر چھڑکاؤ کیا اور پھر جیب سے ماچس کی ڈبیا نکال کر تیلی جلا کر جوتے پر پھینک دیا۔ پیٹرول جھٹ آگ پکڑ کر غضب ناک طریقے سے جوتے کو جلانے لگا۔

سارے طلبہ و طالبات جو نویں جماعت کے طالب علم تھے مگر میری نظر میں ابھی بھی بچے ہی تھے......دم بخود تماشہ دیکھ رہے تھے...... کیونکہ لڑکیاں آگے بیٹھا کرتی تھیں تو کچھ کی آنکھوں میں ڈر اور کچھ کی آنکھوں میں آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں اپنے جوتوں کا یہ حال دیکھ کر خود بھی شاید پیلی پڑ چکی تھی اور یہی بات اس کو اور بھی مسرور کر گئی تھی۔ وہ چند لمحے مجھے بغور دیکھتا رہا اور پھر یہ کہتا ہوا چل پڑا کہ......'' امید ہے کہ یہ سبق یاد رہے گا......''

میں اس کے پیچھے پیچھے ننگے پیر کلاس سے باہر نکل آئی۔ دیکھا تو اسکول کی پرنسپل اور چپراسی سمیت دو چار ٹیچرز بھی کھڑی تھیں۔ ہمیں باہر آتا دیکھ کر سب ادھر اُدھر بکھرنے کی کرنے لگے مگر کوریڈور اتنا وسیع نہیں تھا لہٰذا نظروں سے بچنے کی کوشش ناکام ہی تھی۔ وہ سب پر ایک قہر انداز نظر ڈالتا تیز قدموں سے چلتا کوریڈور سے نکل گیا۔ پرنسپل، اُس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی مجھے میرے بازو سے پکڑ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چل پڑیں۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں کلاس میں بچوں کو دلاسہ دینا چاہتی تھی کہ مجھے ابھی خود کا ہوش نہیں تھا۔ سچ بات یہ تھی کہ میں خود بھی حد سے زیادہ سہم چکی تھی۔

وہ بوتلیں مجھ پر...... میرے جسم پر...... میرے چہرے پر بھی اُنڈیل سکتا تھا......اوراُسے یہاں روکنے والا تھا ہی کون......!

''پلیز......کل سے آپ نہیں آئیں گی ...... یہ میری غلطی سمجھیں کہ میں نے آپ سے مدد مانگی مگر میں کسی بھی طرح اور رسک نہیں لینا چاہتی ......آج حد ہوچکی ہے......اب آپ ابھی گھر جائیں اور دوبارہ یہاں اس اسکول میں تشریف نہ لائیں......''

پرنسپل نے سخت تو کبھی التجائی لہجے میں مجھ سے درخواست کی ۔ میں ابھی تک دم بخود تھی لہٰذا اٹھ کر ننگے پیر اسٹاف روم میں آ گئی ۔ حامد (چپراسی) میرے لئے جھٹ سے ٹھنڈا پانی لے آیا اور کسی ٹیچر نے مجھے نرمی سے کندھوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کب منہ بسور کر باقاعدہ آنسوؤں سے مگر بے آواز رونے لگی تھی......کسی نے میرے ہاتھ میں دو چار ٹشو تھما دیئے اور پھر سب میرے اردگرد سے اچانک غائب ہو گئے۔

مجھے اسی طرح بیٹھے بیٹھے پتہ نہیں کتنا عرصہ گزرا بہرحال چھٹی ہو چکی تھی اور ایک دو کر کے اسٹاف روم تقریباً خالی ہو چکا تھا...... میں بھی کسی چابی بھرے کھلونے کی طرح اٹھ کر الماری سے اپنا بیگ نکال کر اسٹاف روم سے نکلی ہی تھی کہ میرے ننگے پیر ایک ڈبے سے ٹکرائے ۔ وہ جوتے کا ڈبہ تھا جو یقیناً میرے لئے ہی رکھا گیا تھا میں نے جھک کر اُسے ہاتھوں میں اٹھائے بغیر زمین پر پڑے پڑے کھول کر دیکھا تو اُس میں میرے ہی سائز کی استعمال شدہ چپل پڑی تھیں......اور مجھے پہلی بار یاد آیا کہ میرے پاؤں ابھی تک خالی تھے۔ میں نے چپل پہن کر سر اٹھایا تو دیکھا سامنے صالحہ کھڑی تھی ۔ وہ اسی طرح پورے برقعے میں تھی اور ہمیشہ کی طرح صرف اس کی آنکھیں بات کر رہی تھیں...... مجھے اپنی اس طالبہ سے بڑا پیار تھا......مگر وہ ذرا جھجکی ہوئی رہتی اور قریب آ کر بات کرنے یا کام کی بات کے علاوہ کسی بھی قسم کی بات کرنے سے کتراتی تھی ......اور کیونکہ میں ایک عام ٹیچر نہیں تھی لہٰذا میرا ہمیشہ دل ہوتا کہ صالحہ سے کچھ دیر بیٹھ کر گپ لگایا کروں ...... اس کی فلسفیانہ سوچ اور دور اندیش نظریوں کو سن کر میں اکثر پریشان ہو جاتی تھی......وہ اتنی عمر کی تھی نہیں جتنی اس نے خود پر طاری کر لی تھی بقول کچھ ہم جماعتوں کے وہ اپنے گھر کی بڑی تھی ۔ چار چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ اپنے سبزی بیچنے والے باپ کی بھی دیکھ بھال کرتی تھی ۔ ماں کا کئی سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔سوتیلی ماں تھی مگر وہ صرف آرام کرتی تھی ۔

میں چپل پہن کر احسان مندسی ہو کر اس کی طرف بڑھی......وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی......یعنی جو حدود اس نے اپنے اردگرد قائم کر رکھی تھیں میں ان کو توڑنے والی تھی میں بھی اپنی جگہ جم گئی ،جس پر اُس کی آنکھوں کے اظہار سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مسکرا گئی تھی ۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا......اب آپ سکون سے گھر جائیں اور کچھ دن چھٹیاں منالیں......آپ کو اس کی ضرورت ہے۔''

میں بھی تھک گئی تھی اور ابھی میرا دل نہیں تھا کہ کسی سے بھی کوئی بھی بات کروں لہٰذا میں اس کو وہیں کھڑا چھوڑ کر اسکول کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

مجھے اس اسکول میں پڑھاتے یہ چوتھا مہینہ تھا۔ میں کوئی باقاعدہ ٹیچر نہیں تھی نہ ہی مجھے یہاں بطور ٹیچر کے رکھا گیا تھا یہ ہمارے محلے کا گورنمنٹ اسکول تھا اور ایک دن جب میں اپنے کچھ کاغذات کو اٹسٹ کروانے یہاں کی پرنسپل کے پاس آئی تھی تو انہوں نے بتایا کہ ٹیچر آتے ہی نہیں اور بچارے بچے کلاس میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے جو ایک دو دیانت دار ٹیچر ہیں ان کے اوپر ہی پورے اسکول کا بوجھ تھا مگر وہ بھی کتنی کلاسیں لیتے ۔ میں اس زمانے میں ایک انٹرنیشنل آرگنائزیشن میں نوکری کرتی تھی لہٰذا میرے ذہن میں بھی یہ بات نہ آئی کہ میں اپنی خدمات پیش کر دوں مگر پھر میں نے اونچی دکان اور پھیکے پکوان کی مصداق پریشان ہو کر نوکری چھوڑ دی اور پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہی تھا کہ میں اس اسکول میں کم از کم اس وقت تک پڑھا دوں جب تک میں کوئی دوسری نوکری تلاش نہ کرلوں۔

مگر پڑھانے میں بچوں کے ساتھ مجھے کچھ ایسی انسیت ہو گئی کہ میں نے چار مہینے گزر جانے کے باوجود بھی اسکول سے چھٹکارا حاصل

کرنے کا ارادہ ختم ہی کر دیا تھا۔ نہ مجھے تنخواہ ملتی تھی نہ ہی میں کسی امتحان میں کلاس وغیرہ میں جاسکتی تھی۔ مگر پھر بھی میں اسکول میں بہت اچھے نام سے پہچان کرا چکی تھی اور ہر طالب علم مجھے دیکھتے ہی ادب سے سلام دعا کر لیتا تھا۔ مجھے بھی یہ سب اب اچھا لگنے لگا تھا زندگی میں پہلی بار اپنی زندگی کا کوئی مقصد کوئی جواز مل گیا تھا۔ مگر پھر کسی ولن کی طرح ''باس'' آن ٹپکا۔

شروع کے چند دنوں میں ہی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ آدھے سے زیادہ اسکول پر قبضہ ہے......ایسی کلاسیں جن کی چھت ٹپکتی تھی بس وہی بچوں کے لئے رہ گئی تھیں باقی تمام مضبوط چھت والی کلاسیں اور اسٹور روم یہاں تک کہ لائبریری سب کے سب اس کے قبضے میں تھے جو علاقے میں ''باس'' کے نام سے مشہور تھا......اس نے چند ایک گینڈے نما نوکر رکھے ہوئے تھے......تھانے میں ہفتہ وار بھتہ دیتا تھا اور ان کے ہی بل بوتے پر وہ محلے میں مان مانی کرتا تھا......اسکول کی کلاسیز جو باس نے قبضہ میں کر رکھی تھیں ان کو اس نے مختلف اداروں اور لوگوں کو کرائے پر دے رکھا تھا......کسی میں کسی سپر اسٹور کا مال لا کر رکھا جاتا تھا......کسی میں شادی بیاہ میں ٹینٹ اور کھانے لگانے والے اپنے ٹینٹ اور پردے کرسیاں لا کر ڈھیر کرتے تھے اور کسی میں تین چار دوسرے شہروں سے آئے ہوئے چوراچکے ٹائپ کے مرد قیام پذیر تھے۔ ان سب میں مشترک بات یہ تھی کہ یہ اسکول کھولنے سے پہلے اور بند ہونے کے بعد ہی اسکول میں دندناتے پھرتے تھے لہٰذا کسی کو بھی ان کرایہ داروں کے کوائف کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا......ماجد کچھ کچھ جانتا تھا مگر زبان کھولنے سے ڈرتا تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ ایک ہی کمرے میں دو چار جماعتوں کے بچے بیٹھ کر سبق لیتے ہیں تو پرنسپل کو غیرت دلائی کہ اپنا اسکول ان غنڈوں سے خالی کروائیں۔ وہ بچاری کہاں ان سب میں شامل تھیں لہٰذا وہ تو بار بار اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا واسطہ دے کر دور ہو چکی تھیں۔

میں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور ایک دن جا کر محلے کے ناظم کو درخواست دے دی تھی جس پر ایک ٹیم اسکول کا معائنہ کر کے جا چکی تھی اور اس کے بعد ہی باس بلبلاتا ہوا سیدھا میری کلاس میں آدھمکا تھا...... جو ٹیم آئی تھی اس میں باس کا کوئی حامی یا راز دار تھا جس نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ فساد کی اصل جڑ میں ہوں۔

میں......اب خود سے سوال کر رہی تھی......دو تین دن کے آرام کے بعد اپنے ہوش و حواس میں آچکی تھی...... ''تو بس......کیا اسی سب کے لئے میں وہاں گئی تھی......تو کیا میرا کردار بس اتنا ہی تھا......'' میں افسوس میں مبتلا تھی اور کوئی راستہ ہی نہیں سوجھ رہا تھا۔

تیسرے دن میرے موبائل پر فون آیا۔ پہلے تو کسی نے میری آواز سن کر بند کر دیا پھر ایک قطار میں تین چار مختلف نمبروں سے فون آنے لگے مگر ہر بار میری آواز سن کر فون بند کر دیا جاتا......میں سمجھ رہی تھی کہ شاید اسکول سے کوئی تو میری خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرے گا ہی، اس اُمید پر ہر بیل پر ہر نمبر پر کال ریسیو کر لیتی تھی۔ آخر کار ایک آواز نے مجھے میرے کوائف بتانے شروع کئے جیسے کسی مریض کو ڈاکٹر سپاٹ آواز میں اس کی بیماری کے بارے میں احتیاط گنواتا جائے......میں بھی ہر ایک سوال پر ہاں کی گردان کئے جا رہی تھی......پھر سب کچھ معلوم کر لینے کے بعد ریسیور کسی اور کو دیا گیا۔ اب کی بار کوئی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنا تعارف کسی نیوز ٹی وی چینل کی کمپیئر کے طور پر کروایا اور بتایا کہ میری جو ایک ویڈیو فیس بک پر گردش کر رہی ہے کیا میں اُس کی سچائی کی تصدیق کر سکتی ہوں؟

میں بڑی حیران ہوئی۔ میں نے خاتون کو بتایا کہ میں ایسی کسی ویڈیو کی سچائی کیسے بیان کروں جو کہ میں نے دیکھی ہی نہیں۔ اب حیران ہونے کی باری خاتون کی تھی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فیس بک میں اب تک اس ڈھائی منٹ کی ویڈیو کو چالیس ہزار تک کومنٹس مل چکے ہیں اور ویڈیو میں صاف صاف اسکول اور آپ کا نام لکھا دکھایا گیا ہے......زیادہ تر کومنٹس ویڈیو کی تصدیق کرانے پر مبنی ہیں......''

میں اب بیزار سا محسوس کرنے لگی۔ میں نے اسی بیزاری سے خاتون کو سمجھایا کہ میں چار پانچ دن سے فیس بک پر جا نہیں سکی ہوں اور

نہ ہی میں نے کوئی ویڈیو اپ لوڈ کی ہے۔

خاتون نے مجھے اسی وقت فیس بک پر جا کر ویڈیو لنک چیک کرنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد فون کرنے کا کہہ کر بند کر دیا۔ گو میرا دل بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح بستر سے نکل کر اپنا لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی جس کی بیٹری ختم ہو جانے کے باعث اب وہ بھی ایک کمپیوٹر کی طرح بس بجلی آنے تک چلتا تھا۔ میں نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا اور خاتون نے جو مجھے ویڈیو لنک لکھوایا تھا وہ جیسے ہی ٹائپ کیا میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

باس نے جو کلاس میں میرے جوتوں پر تیزاب اور پیٹرول چھڑک کر آگ لگائی تھی وہ پورا واقعہ ویڈیو کی شکل میں بار بار میرا لیپ ٹاپ چلاتا جا رہا تھا...... پہلے میں نے باس کی حرکات کا جائزہ لیا...... پھر خود کو پیلی رنگت کے ساتھ کانپتے دیکھا...... کچھ لوگ کلاس کی کھڑکیوں اور دروازے سے جھانکتے ہوئے بھی نظر آ رہے تھے مگر کیمرے کی آنکھ جس سمت سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کیمرا کلاس میں بیٹھے کسی بچے کے ہاتھ میں تھا اور اس نے بڑے اطمینان سے تمام ہی مناظر فلم بند کر لئے تھے...... میں نے دیکھا کہ مسلسل اس ویڈیو کو لائک ملتے جا رہے تھے...... کسی انجان سے نام کی آئی ڈی سے اپ لوڈ کی ہوئی ویڈیو لاکھوں لوگوں کی نظروں میں آ چکی تھی اور تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی۔

میں فون کی گھنٹی سے چونک پڑی۔ میں نے مرے مرے انداز میں فون ریسو کیا۔ وہی خاتون کمپیئر تھیں اور انہوں نے پھر وہی سوالات دہرانے شروع کر دیئے۔ میں نے ان سے التجا کی کہ پلیز مجھے اس سب سے دور رکھیں میں اب اس پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی ...... جس پر خاتون نے مجھے اتنا ہی بتایا کہ وہ اس ویڈیو کو آج رات اپنے پروگرام میں استعمال کرنے والی ہیں اور فوٹو شاپ کی مدد سے میری شکل کو دھندلا کروا دیں گی تا کہ میری ذاتی زندگی پر اس کا اثر نہ آئے۔ میرے پاس انکار کی کوئی صورت نہیں تھی یہ تو ان کا ہی احسان تھا کہ انہوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور پھر مجھ سے اجازت لے رہی تھیں یا کم از کم اطلاع تو دے رہی تھیں...... میں چپ سادھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے رات میں ان کے پروگرام کو کانپتے کانپتے دیکھا اور خاتون نے جو دو ایک گورنمنٹ افسران، پولیس کے اعلیٰ عہدیداران بلائے تھے ان سب کے اعتراضات اور خیالات سنتی رہی...... بہرحال پروگرام میں طے یہ پایا گیا کہ کل صبح خاتون اپنی پوری ٹیم کے ساتھ اسکول جائیں گی اور پولیس اور گورنمنٹ افسران کی موجودگی میں اسکول کو باس کے ناجائز قبضے سے خالی کروا دیا جائے گا۔

اور پھر یہی ہوا۔ دوسرے پورے دن اس نیوز چینل میں بس یہی سب دھما چوکڑی دکھائی جاتی رہی اور کیونکہ یہ قدم صرف اسی نیوز چینل نے اٹھایا تھا تو سارا دن بریکنگ نیوز بنا کر نیوز چینل اپنا بھی پرچار کرتا رہا خیر اسکول میں گورنمنٹ افسران، پولیس اور نیوز چینل کے کیمرا مین، خاتون کمپیئر کے ساتھ مزدوروں کی ایک ٹولی تھی جس نے ایک ایک بندے کمرے پر پڑے تالے کو سب کے سامنے توڑ کر سامان اسکول سے باہر نکال نکال کر پھینک دیا۔ ایسے میں جو کرایہ دار تھے وہ ڈر کے مارے سامنے نہیں آ رہے تھے اور کیمرا یہ بھی دکھا رہا تھا کہ سپر اسٹور کا مال جو باہر پھینکا جا رہا تھا اس کو اچکے اٹھا اٹھا کر چلتے بن رہے تھے۔

میں جو رات تک عجیب کشمکش میں تھی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی اور دل ہی دل میں ایک طرح کی فتح محسوس کر کے خود میں بڑی مگن تھی۔ رات کافی دیر کے بعد میرے پاس خاتون کا فون آ گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں نے سب دیکھا یا نہیں اور یہ بھی بتایا کہ پرنسپل نے ان کو میرے بارے میں بتایا تھا اور فون نمبر بھی دیا تھا ساتھ میں انہوں نے مجھے کافی سراہا کہ میں ایک عورت ہو کر بھی اس طرح باس جیسے لوگوں سے لڑ پڑی تھی اور یہ بھی کہ اسکول پر کچھ مہینوں کے لئے پولیس خاص طور سے نظر رکھے گی کہ باس دوبارہ نہ آ سکے اور اگر وہ آ ہی گیا تو ہم پھر اس کو نکال باہر کریں گے...... میں نے بھی اب کی بار خاتون کو شاباشی دی کہ انہوں نے اس طرح ویڈیو پر نظر کی اور ان کی ذرا سی توجہ سے اسکول کا بھلا ہو گیا ہم دونوں ایک دوسرے کی خوشی خوشی ڈھیر ساری تعریف کرتے رہے اور یوں آخر کار فون بند کر دیئے گئے۔

دوسری صبح میرے پاس پرنسپل کا فون آ گیا کہ ابھی بھی اسکول کے ٹیچر نہیں آتے اور اسکول میں ابھی بھی ٹیچر کی اشد ضرورت ہے تو اگر میں اسکول کی مدد کر سکوں اور اپنا کچھ وقت اسکول میں بچوں کی کلاسز لے لوں......تو......میں بھی خوشی خوشی راضی ہو گئی۔

دو دن کے بعد میں پہلی بار اسکول گئی تو دل میں بہت فخر محسوس کر رہی تھی اور دل کافی مطمئن تھا اسکول میں جاتے ساتھ ہی میں پرنسپل کے آفس پہنچ گئی۔ انہوں نے مجھے پہلے تو گرم جوشی سے گلے لگایا اور پھر چائے پی کر ہی کلاس میں جانے کا کہا۔ میں ان کی پوری روداد بڑے انہماک سے سن رہی تھی کہ انہوں نے مجھ سے کہا۔

''ہاں یاد رہے کہ آپ صالحہ کو ایک دو دن زبردست قسم کی سزا دیں گی۔''

''صالحہ کو؟ مگر کیوں؟'' میں حیران ہو گئی۔

''ارے......اسکول میں بچوں کا موبائل لانا منع ہے نا......پھر بھی وہ اس دن موبائل لے کر آئی تھی اور باقاعدہ دھڑلے سے مووی بھی بنائی تھی......لہٰذا آپ اسے ذرا سخت سی سزا دے دیجئے گا کہ دوسروں کو بھی سبق مل سکے۔''

میں سر ہلاتی خاموش ہو گئی اور اچانک مجھے خیال آیا تو میں نے پرنسپل سے چونک کر پوچھا ''صالحہ تو اتنی غریب سی بچی ہے اس کے پاس مووی بنانے والا موبائل کہاں سے آیا اور مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ وہ مووی اس نے ہی فیس بک پر ڈالی تھی؟''

پرنسپل اب زیرِ لب مسکرانے لگیں......اور مجھے کچھ شک سا ہونے لگا......پھر وہ مسکراتی ہوئی گویا ہوئیں......'' بھئی میں کیا کہہ سکتی ہوں میرے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں......آپ تو جانتی ہی ہیں میں ان سب باتوں سے کتنا دور بھاگتی ہوں......''

میں پہلے تو ان کی بات سمجھنے کے لئے چپ ہو گئی پھر اچانک ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

☆......☆......☆

نوشین اصغر

ڈاکٹر بیوی ڈاکٹر بہو

گزشتہ دنوں غیر ملکی نیوز چینل پر ایک پروگرام ہوا جس میں بتایا گیا کہ آجکل پاکستانی معاشرہ میں ڈاکٹر بیوی اور ڈاکٹر بہو کی طلب بہت بڑھ گئی ہے۔ ہر کوئی اپنے بیٹے کے لئے ڈاکٹر بیوی کی تلاش میں ہے۔

ادھر پاکستان کے میڈیکل کالج دھڑا دھڑ 70:30 کے تناسب سے لڑکے لڑکیوں کو ڈاکٹر بنا رہے ہیں یعنی 70 فیصد لیڈی ڈاکٹرز۔ لڑکیوں کے ماں باپ نے بھی یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر ان کی بیٹی ڈاکٹر بنتی ہے تو اس کو اچھا رشتہ ملنے میں آسانی ہوگی۔ اس کے لیے وہ اپنی بیٹیوں کو بھاری فیسوں کے ساتھ پرائیویٹ میڈیکل کالج میں پڑھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے ادھر وہ لڑکیاں جو ڈاکٹر نہیں بن سکیں ان کے رشتے کرنا ان کے ماں باپ کے لئے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔

کچھ لالچی لوگوں کی نفسیات تو یہ ہوتی ہے کہ بہو آئی ہے تو وہ اب کما کر بھی دے اور خاتون خانہ کی بھی ساری ذمہ داریاں ادا کرے۔ کچھ خاندان ڈاکٹر بہو کو لے آتے ہیں کہ معاشرہ میں ناک اونچی رہے لیکن ان سے نوکری کروانا ان کی شان کے خلاف ہوتا ہے اور ان کو زبردستی گھر بٹھا کر حکومت کا پیسہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ کچھ لڑکیاں خود دو دو ذمہ داریاں اٹھانے کی بجائے گھر بیٹھنے کو ترجیح دیتی ہیں اور جو اپنی شدید خواہش کے پیش نظر کام کرتی ہیں اور ان کے گھر والے ان سے تعاون بھی کرتے ہیں تو وہ بھی چالیس سال کی عمر تک پہنچتے ہوئے تھک کر چور ہو چکی ہوتی ہیں اور گھر اور بچوں کے سلسلے میں جو کوتاہیاں ان سے ہوئی ہوتی ہیں اس کی وجہ سے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑی ہوتی ہیں۔

ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے سے میں آپ کو اپنے ذاتی تجربے سے مستفید کرنا چاہوں گی کہ ایک ڈاکٹر لڑکی پر ایک ڈاکٹر کے ساتھ شادی کے بعد کیا بیتتی ہے۔

آج سے 50 سال پہلے جب میں نے آنکھ کھولی تو پاکستانی معاشرے میں مادیت پرستی کا ایسا حال نہیں تھا۔ ڈاکٹری کا پیشہ انتہائی معزز سمجھا جاتا تھا نہ کہ پیسے کمانے اور اچھے رشتے ہونے کا ذریعہ۔

نانی مرحومہ نے اپنے سب بچوں سے کہا ہوا تھا کہ کم از کم اپنے ایک بچے کو ضرور ڈاکٹر بنانا علاج معالجے میں آسانی ہوتی ہے پینسٹھ سال پہلے پاکستان میں ویسے بھی کم ڈاکٹر بنتے تھے اور لڑکیاں تو اور بھی کم تھیں۔ ایسے میں میرے ننھیال میں میری دو خالائیں، ایک ماموں اور دو ممانیاں ڈاکٹر تھیں۔ نانا کے سگے بھائی بھی ڈاکٹر تھے اور پاکستان کے پہلے سرجن تھے۔ آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو ذہن میں یہ پہلے سے موجود تھا کہ بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا ہے۔

سونے پر سہاگہ بڑے کزنز جو عمر میں ہم سے کافی بڑے تھے ان کے ڈاکٹر بننے پر جو خوشیاں منائی گئیں اس سے چھوٹے بچوں کے ذہن میں یہ راسخ ہو گیا کہ ڈاکٹر بننا ہی کمال ہے اور زندگی کا ہر کمال ڈاکٹری سے شروع ہو کر ڈاکٹری پر ختم ہوتا ہے سب سے بڑی خالہ جو لاہور کالج میں اسلامیات کی پروفیسر تھیں وہ کہتی تھیں سب بچوں کو خواہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں یا نہیں ان کو F.SC تک سائنس ضرور پڑھانی ہے کیونکہ arts کی لڑکیاں بہت زیادہ فارغ رہنے کی وجہ سے کالج میں مختلف خرافات میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ سائنس کی لڑکیوں کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ چنانچہ خاندان کے سب بچوں نے جن میں اکیس لڑکیاں اور دس لڑکے تھے، سائنس لی۔ ہمیں صرف تین شعبوں کا پتہ تھا۔ ڈاکٹر انجینئر اور استاد۔ چوتھے کسی شعبے کا نام ہمیں نہیں پتہ تھا۔

میں میری دو بڑی بہنیں اور کزنز فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں

داخل ہوگئیں۔ بچپن سے میڈیکل کالج کی باتیں سن کر ڈاکٹر بننے کا شوق اور بڑھ گیا۔ گاڑی بھر کر ہم کزنز پہلے لاہور کالج اور پھر فاطمہ جناح میڈیکل کالج گئے گھر والے ہماری کامیابیوں پر خوشیاں مناتے اور ہمیں بہت انعامات ملتے۔

ان حالات میں زندگی کی معراج میرے نزدیک ڈاکٹری تھی اگرچہ جب میرا میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تو مجھ سے پہلے میری بڑی دو بہنوں سمیت خاندان کے بہت سے ہونہار بچے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ چنانچہ مجھے اپنی قدر ومنزلت میں کچھ کمی محسوس ہوتی تھی۔

میں ابھی میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی کہ میری دونوں بہنوں کی یکے بعد دیگرے شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد ان کے بچے اور ساتھ نوکریاں شروع ہوگئیں۔ ایک بہن کی ساس بھی ڈاکٹر تھیں اور جاب کرتی تھیں۔ دونوں بہنیں صبح اپنے بچے بمع ان کے کھانے کپڑوں کے امی کے گھر آتیں، ان کو وہاں چھوڑ کر اپنے کاموں پر چلی جاتیں۔ امی اور میں ملازموں کے ساتھ مل کر ان کو سنبھالتے۔ دوپہر کو واپسی پر وہ بچے لیتیں امی کے گھر دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے گھر چلی جاتیں۔ میری امی اس سے پہلے اپنی ڈاکٹر بہنوں اور ڈاکٹر بھابھی کے بچوں کی ذمہ داری بھی اٹھا چکی تھیں۔ عمر کے اس حصے میں ڈاکٹر بیٹیوں کے بچوں کی ذمہ داری نے ان کو کسی حد تک تھکا دیا تھا امی کا وہ شوق جو اولاد کو ڈاکٹر بنانے کا تھا۔ میرے میڈیکل کالج میں آنے تک کافی کم ہوگیا تھا۔

بہنوں کی زندگی میں دوڑ دھوپ لگی ہوئی تھی۔ کم وبیش ویسی ہی زندگی ان کزنز کی بھی تھی جو ڈاکٹر بن گئی تھیں۔ عمر کم تھی اور طاقت زیادہ، یہ سب اچھا بھی لگتا تھا اور قابل عمل بھی اس لئے ذوق وشوق سے ڈاکٹر بننے کا عمل جاری رہا۔ فائنل ائیر کے اختتام تک میرا آرمی کے کیپٹن کے ساتھ رشتہ طے ہوا اور ہاؤس جوب کئے بغیر رخصتی ہوگئی اب تک زندگی کے بیس سال ایک خواب کی طرح گزارے تھے اور اب اس خواب کے ٹوٹنے کا عمل شروع ہوا۔

سب سے پہلے امی نے بھانپ لیا کہ لڑکی کا دماغ تو کچھ زیادہ ہی ڈاکٹر ہوگیا ہے۔ اس لئے انہوں نے شادی کے فوراً بعد کہنا شروع کردیا کہ لڑکی کے لئے سب سے اہم اس کے بچے اور گھر ہوتا ہے۔ میاں صاحب جو خود ایک عدد ڈاکٹر بہن، دو عدد ڈاکٹر بھائی اور ایک ڈاکٹر بھابھی رکھتے تھے بڑی جلدی ہمارے گھر کے حالات اور مجھے سمجھ گئے۔ میں نے جب ان سے اپنی ہاؤس جاب کرنے کی فرمائش کی تو انہوں نے نئی نویلی دلہن کی پہلی فرمائش کے جواب میں کہا ہاؤس جاب ضرور کرواؤں گا مگر اپنی ذمہ داریاں ہم نے خود اٹھانی ہیں۔ میری ماں اور آپ کی ماں بوڑھی ہوگئی ہیں وہ کام جو میری بہن اور آپ کی بہنوں نے کیا ہے اس کی اجازت میں نہیں دوں گا۔ میری نند بھی ایم فل فزیالوجی کر رہی تھیں اور بچے اکثر میری ساس کے پاس چھوڑ جاتی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد میری ایک عدد ڈاکٹر دیورانی بھی تشریف لے آئیں اس نے بھی میری طرح ہاؤس جاب نہیں کی ہوئی تھی۔ اس کی بھی دو عدد بہنیں ڈاکٹر تھیں جو اپنے بچے اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر ہسپتال میں نوکری کر رہی تھیں۔

میرے سسرال کے تین عدد ڈاکٹر لڑکے گھریلو بیویاں چاہتے تھے۔ لیکن میری نند کی ضد تھی کہ اگر ان کی ساس کو اپنے دو نان ڈاکٹرز بیٹوں کے لئے ڈاکٹر بہوئیں مل سکتی ہیں تو میرے تین لائق فائق ڈاکٹر بھائیوں کو ڈاکٹر بیویاں کیوں نہیں مل سکتیں۔ لہٰذا ہم تین عدد جٹھانی، دیورانیاں ڈاکٹر آ گئے اور سب کے میاں جو ایک پرسکون گھر اور گھریلو بیویوں کے آرزومند تھے انتہائی شوق سے بنی ہوئی ڈاکٹروں کے شوہر بن گئے۔

حالات ایسے ہوئے کہ ہم تینوں ہاؤس وائف بن گئیں اور زندگی کے بہترین ساتھی اور بچے ملنے کے باوجود دل کا ایک گوشہ بہت اداس رہتا تھا۔ اکثر تینوں بیٹھ کر غم غلط کرتیں۔ میرے میاں صاحب نے بیوی کے غم کو محسوس کیا اور اپنے ہسپتال کوئٹہ سی ایم ایچ میں ہاؤس جاب کرنے کا بندوبست کردیا۔ اب وہاں نہ میری امی اور نہ ان کی امی، چھوٹا سا بچہ جسکو چھوڑ کر ہسپتال جانا مجھے سوہان روح لگا۔

میاں صاحب نے بیٹ مین کی بیوی کو بچے کے لئے مقرر کردیا مگر وہ ولولہ جو ڈاکٹر بننے کے وقت تھا ہاؤس جاب کرتے وقت اس میں

بیٹے کو چھوڑنے کی پریشانی بھی شامل ہوگئی۔

میاں نے بہت اچھی طرح وعدہ نبھایا۔ چونکہ وہ خود بھی کوئٹہ سی ایم ایچ میں تھے اس لئے وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھتے وقت پر مفید مشورے دیتے۔ گیارہ بجے چائے کا وقفہ ہوتا سب لوگ ٹی روم میں چائے پیتے اور وہ میری آسانی کے لئے میرے ساتھ اپنے کمرے میں پیتے جس کا بہت جلد ہسپتال کی باقی لیڈی ڈاکٹرز نے برا منانا شروع کردیا کہ ان کے میاں تو ان کے ساتھ چائے نہیں پیتے اس لئے یہ بیشک سول ڈاکٹر ہے مگر یہ ہمارے ساتھ چائے پیئے گی۔ میاں کے میرے ساتھ تعاون کو ہسپتال میں سب نے محسوس کیا اور اس کی تعریف بھی کی۔ اسی طرح آرام کے ساتھ میرا سال ختم ہوا تو آنکھوں نے آرمی میں میاں کے ساتھ نوکری کرنے کا خواب دیکھنا شروع کردیا۔ مگر وہ صرف ذمہ دار خاوند ہی نہیں بلکہ ذمہ دار باپ اور بیٹے بھی تھے۔ انہوں نے اس تجویز کو یکسر رد کردیا اور کہا ''اگر تمہیں اتنا شوق ہے تو خود نوکری کے لئے درخواست جمع کرواؤ اور بعد میں حالات کا بھی خود ہی مقابلہ کرنا مجھ سے تعاون کی امید نہ رکھنا، اور نتائج کی بھی خود ذمہ دار ہوگی۔ میاں کا موڈ دیکھ کر فوراً ہی ہتھیار پھینک دیئے لیکن دل کی خواہش اور خواب کہ ہسپتال میں کام کرنا ہے، کہیں نہ گیا۔

اب میں دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک میکے کا گروپ جو ورکنگ ڈاکٹرز کا گروپ تھا، ان کے مسائل اور ایک سسرال کے نان ورکنگ ڈاکٹرز کا گروپ جن کے لائق میاں نے ان کو گھر بٹھایا ہوا تھا، ان کا ڈاکٹری نہ کرنے کا دکھ، اور یہ دکھ بعض دفعہ اتنا حاوی ہوجاتا کہ ہماری ازدواجی زندگی کی خوشیوں کو کم کردیتا تھا۔

میں دونوں طرح کے گروپ سے براہ راست تعلق میں تھی اور رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ ہم ڈاکٹرا گر کام کریں تو مسئلے اور نہ کام کریں تو مسئلے...... ہماری زندگی یکسو نہیں ہوتی۔ سہیلیاں، بہنیں، کزنز جو ڈاکٹر تھیں سب کے ساتھ ایک طرح کے حالات...... یا تو کام کرنے کا دباؤ یا کام نہ کرنے کا دباؤ۔

میری ایک سہیلی جو ایف سی پی ایس گائنی کررہی تھی ایک دن مجھے بتانے لگی کہ میرے میاں بات کرنے سے پہلے بہت لمبی تمہید باندھتے ہیں، میرے سو طرح کے کام ہوتے ہیں، بچوں کو پڑھانا ان کو سلانا، کھلانا اپنا پڑھنا گھر کے کام۔ میاں کی بات شروع ہوتو ختم ہونے میں کافی وقت لیتی ہے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا آپ to the point بات کریں۔ میرے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔ اس پر وہ سخت ناراض ہوگئے اور کہنے لگے تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔

میری گائنا کالوجسٹ خالہ اکثر کہا کرتی ہیں میں ساری رات آپریشن تھیٹر میں کام کرتے ہوئے اتنا نہیں تھکتی جتنا باورچی خانہ میں ایک گھنٹہ کام کرنے کے بعد تھک جاتی ہوں۔ زندگی کسی اور طرح بھی سانس لیتی ہے۔ اور یہ اور طرح بھی بہت خوبصورت ہے۔ اس کا احساس مجھے اپنے بھائی کی شادی کے بعد ہوا۔ میرے بھائی کی بیوی کا انتخاب کرتے ہوئے میری امی کا ذہن بالکل صاف تھا کہ ''ڈاکٹر بہو نہیں لانی...... میں تین بیٹیوں کو ڈاکٹر بنا کر بھر پائی۔ بیٹے کے لئے ایسی بیوی چاہیے جو اس کے گھر آنے پر اسکا استقبال کرے، اس کا خیال رکھے'' (غالباً سمدھنوں کے بیٹوں کو دیکھ کر سبق سیکھا) چنانچہ میری بھابھی کی پسندیدگی کی دیگر وجوہات کے ساتھ ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ بی اے کے بعد اس نے ایم اے کرنے کے لئے یونیورسٹی جانے سے اس لئے انکار کردیا کہ وہ لڑکوں کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہتی۔ امی کو اس کی یہ بات بہت پسند آئی کہ لڑکی شرم و حیا والی ہے اور گھر میں رہنے کو پسند کرنے والی ہے۔ چنانچہ میرے بھائی اور بھابھی کی شادی ہوگئی۔ امی جس طرح کی بہو چاہتی تھیں امی کو اللہ نے دے دی۔ پرسکون گھر میں رہنے والی میاں کا انتہائی خیال رکھنے والی، جس کو دیکھ کر نہ صرف میری امی خوش ہوتی ہیں بلکہ ہم سب کے بچے بھی ممانی جان کو بے حد پسند کرتے ہیں۔

زندگی کا نیا رخ جو میرے لئے اجنبی تھا مجھے دبئی اپنے بھائی کے گھر قیام کرتے ہوئے نظر آیا۔ بھابھی اور بھائی کے دوستوں کی بیویاں سب گھریلو خواتین تھیں ان کے گھروں میں آنا جانا ہوا تو دیکھا کہ میری بھابھی سمیت ان سب عورتوں کے دل میں ایک خانہ ہے! دوسرا خانہ

''دواخانہ'' جو ہم ڈاکٹروں کے دل میں ہے، وہ نہیں وہ جن باتوں پر خوش ہوتی ہیں جن کا آپس میں تبادلہ کرتی ہیں وہ ہم ڈاکٹروں کی زندگی سے بالکل مختلف تھا۔ کھانوں کی تراکیب کا آپس میں تبادلہ خیال گھر کی سجاوٹ بچوں اور میاں کی خوشی میں خوش اور بس! مجھے یہ زندگی بہت مختلف اور اچھی لگی میری بہنوں، کزنز، سہیلیوں، جٹھانی، دیورانی، نند سے مختلف اور بہت مطمئن۔

ادھر میری عقلمند خالائیں اور ممانی جو خود بھی ڈاکٹر تھیں اور ان کے بیٹے بھی ڈاکٹر تھے نان ڈاکٹر بہوئیں لے آئیں اور اپنے گھر کو اس کشمکش سے دور کر دیا جس کا سامنا وہ خود ساری زندگی کرتی رہیں۔

ایک دن میں امی اور خالہ کی باتیں سن کر حیران رہ گئی جو اپنی بہوؤں کی بڑھ چڑھ کر تعریف کر رہی تھیں کہ ماشاءاللہ اپنے بچوں کو پورا وقت دیتی ہیں۔ میاں کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ ادھر ان لڑکیوں کو دیکھو ایک بھاگ دوڑ ان کی زندگی میں لگی ہوئی ہے۔ بچاری دو محاذوں پر لڑ رہی ہوتی ہیں۔ گھر کا محاذ اور ہسپتال کا محاذ۔ ان کی باتیں سن کر دل میں کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا مگر اب کیا ہو سکتا ہے! ہم نے تو ایسا ہی رہنا ہے......دو کشتیوں کا سوار!

پھر اپنے ڈاکٹر بنتے بیٹے کو دیکھ کر میری آنکھوں نے بھی ہر ماں کی طرح اس کے مستقبل کا خواب دیکھا جس میں اسکا گھر اس کے بچے ہوں اور اس کی پیاری سی بیوی......جس کے دل میں ''دوخانہ'' نہیں صرف گھر کا خانہ ہو یعنی ''خاتونِ خانہ''۔

☆......☆......☆

صبیحہ نبوت

ہم زیاں کار سہی!

بڑھاپا عالیہ کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا لیکن اس دستک کو وہ اکثر سنی ان سنی کر دیتی۔ وہ گھر اور بچوں میں اس طرح گھری ہوئی تھی کہ آس پاس کی خبر ہی نہ ہوتی اور ہوتی بھی تو کچھ اور سوچنے کی نوبت نہ آتی۔

مدتوں سے یہی زندگی کے معمولات تھے۔ جب سب سو رہے ہوتے تو وہ اٹھ جاتی اور گھر کے کام شروع ہو جاتے اور رات تک ختم ہونے کا نام نہ لیتے کھانا پکانے سے لیکر سلائی، کڑھائی، بنائی تک خود ہی کرنا پڑتی کبھی ضرورت سے اور کبھی شوق سے۔ زندگی مشین کی طرح گھوم رہی تھی رات کو کبھی کبھی آنکھ کھلتی، ٹارچ کی روشنی میں گھڑی دیکھتی، دل چاہتا تہجد پڑھ لوں لیکن تھکان اور نیند کا غلبہ حاوی ہوتا تو وہ سوچتی کیا میری نماز میں خشوع و خضوع شامل ہوگا؟ دل کہتا نہیں، دماغ کہتا تہجد پڑھنے کے بعد بھی یہ احساس کیوں ہوگا بھلا؟ یوں دل و دماغ کی بحث شروع ہو جاتی۔

وہ اپنے خیالات کو جھٹک کر کہتی آج میں دل کی بات نہیں مانوں گی۔ اپنے اللہ میاں سے لو لگا لوں گی۔ ساری عمر ان بے کار کاموں میں گزار دی۔ کب تک دل کے کہنے پر چلتی رہوں۔ یوں تہجد ادا کر کے فجر کا انتظار ہوتا اور جیسے تیسے وہ بھی ادا ہو جاتی۔

پھر بچے اسکول کے لئے اٹھنے شروع ہو جاتے۔ ہر ایک کی فکر دامن گیر ہوتی۔ کسی کے کپڑے کسی کے جوتے موزے اور کسی کا ناشتہ۔ یوں پانچ بچوں کے کام ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے۔ کبھی ادھر دوڑتی کبھی ادھر۔

امی میرے موزے کہاں ہیں؟ آصف کی آواز آئی۔

میں نے تو کپڑوں کے ساتھ ہی رکھے تھے پھر کہاں گئے؟

کاشف مسکرا کر بولا، میں نے لے لئے۔

اور تمہارے؟

میرے گندے ہو رہے تھے۔

اف اللہ تم لوگ تو مجھے پاگل کر دو گے۔

اتنے میں رانی کی آواز آئی، امی ببلو ابھی تک سو رہا ہے۔

اٹھاؤ نا اسے، اس نے ناشتہ بناتے ہوئے کہا۔

امی میرے لئے فرنچ ٹوسٹ بنا دیں۔

بھئی اب تو میں نے چپس بنا دیئے ہیں فرنچ ٹوسٹ کل بن جائیں گے۔

یہ سن کر رانی نے برا سا منہ بنایا۔ وہ جلدی سے منے کی طرف آئی، سوتے سے گود میں اٹھایا اور غسل خانے میں لے گئی۔ منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے بدلے۔ یوں سب کو تیار کر کے ناشتہ کروایا اور اسکول بھیجا۔

پھر برتن سمیٹے۔ میلے اور دھلے کپڑے الگ الگ کیے۔ کیا غدر بر پا ہے۔ وہ بڑبڑائی۔ نہ جانے ان کو کب عقل آئے گی۔ کیسے سکھاؤں۔ کب یہ سب بڑے ہونگے۔ کب طریقہ اور سلیقہ سیکھیں گے۔ کاش یہ سب میری زندگی میں ہی انسان بن جائیں۔ لیکن ایسا کب ہوگا۔ یوں سوال و جواب کے تانے بانے پردہ خیال پر تیرنے لگے۔ ابھی تو بڑی بھاگ دوڑ ہے کیا ساری عمر یوں ہی گذر جائے گی۔ بچے۔ گھر، رشتہ دار، کیا اپنے کیا پرائے۔ یہ سلسلے تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ میرے لئے وقت ہی نہیں نکلتا...... نہ نمازیں خشوع و خضوع سے ہوتی ہیں نہ روزے۔ اسی ہلچل میں زندگی گذر رہی ہے۔ نماز شروع کرو تو ہزاروں خیال دامن گیر ہوتے ہیں۔ لیکن اب میں اپنے اللہ میاں سے لو لگا لوں گی۔ اور ساری نمازوں کی قضا ادا کروں گی تو بہ استغفار کروں گی اور......

ابھی عالیہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ سبزی والے کی آواز آئی۔ دروازے کی طرف دوڑی کہیں نکل نہ جائے۔ پکانے کا مرحلہ بھی تو طے کرنا ہے اور کیا

پکے یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ پہلے اس کے اوپر غور وفکر کرو۔ پھر غضب خدا کا تین دفعہ اس مرحلے سے گذرو......

لیکن شکر ہے بچے سب کچھ کھا لیتے ہیں ان گھروں کا تصور ذہن میں گھوم گیا جہاں ہر شخص نخرے دکھاتا ہے کوئی کچھ کھاتا ہے اور کوئی کچھ زندگی کتنی عذاب ہوتی ہوگی۔ شکر ہے میرے بچے سب کچھ کھا لیتے ہیں اس سے پہلے جو بچوں سے شکوہ تھا ایک دم دور ہو گیا۔ یہ سوچ کر خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے گھر میں کھانے کے مسائل نہیں۔ بچے اچھے لگنے لگے اور دل چاہا انہیں پیار کر لے۔ اور کبھی کچھ نہ کہے۔

سبزی لے کر سوچا کہ آج آلو کے پراٹھے بنا لوں، سب ہی شوق سے کھاتے ہیں۔ گھر کے ہزاروں کام ختم کئے۔ آلو ابالنے کو رکھے۔ نماز کا وقت ہو گیا سوچا نماز کے بعد کھانا کھائیں گے۔ نماز شروع کی۔ شیطان نے ورغلانا شروع کیا۔ آلو چولہے پر ہیں جل نہ جائیں۔ پانی تو کافی ڈالا تھا۔ آلو میں اور کیا کیا ڈالنا ہے۔ اس نے خیالات کو جھٹکا۔ ساری باتیں نماز میں ہی کیوں یاد آتی ہیں۔ شیطان کو برا بھلا کہا نماز پر توجہ دی کسی کی بات یاد آتی کہ اگر سورتوں کا ترجمہ ساتھ ساتھ ذہن میں رہیں تو پھر دوسری باتیں یاد نہیں آتی ہیں۔ لیکن ہر سورت کا ترجمہ بھی تو نہیں آتا۔

اتنے میں رانی نے منے کو مارا اور اس نے رونا شروع کیا۔ جلدی سے نماز ختم کی بچوں کو چپ کرایا اور کھانے کا کام شروع کیا۔ مزے دار آلو کے پراٹھے دہی، چٹنی اور سلاد کے ساتھ......سب نے خوب کھائے۔

سردیوں کے دن ہوں تو وقت ویسے ہی پر لگا کر اڑتا رہتا ہے جیسے کبھی نہ صبح ہوئی تھی نہ شام۔ سرسراتی ٹھنڈی ہوائیں ......میٹھی شامیں اور گلابی راتیں۔ وقت کے ساتھ اتنی گہری ہو جاتیں کہ وقت وقت ہی نہیں لگتا۔ اسی لئے ظہر، عصر، مغرب بھی ایسے کھڑی ہوتیں جیسے تو چل میں آیا۔ اکثر شامیں مہمانوں کی نظر ہو جاتیں۔ خود نہ بھی جاؤ لیکن آنے والوں کو کون روک سکتا ہے۔ اور ان کے آنے سے خوشی بھی ہوتی۔ پھر رات کو دل چاہتا عشاء کی نماز تسلی سے ہو ہی جائے گی۔ سناٹا ہے سکون ہے۔

شکر ادا کیا اور نماز شروع کی۔ تھوڑی سی پڑھی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اس کی آواز کو درگذر کیا۔ لیکن دل اسی طرف لگا رہا۔ نہ جانے کون ہوگا۔ کیا کام ہوگا۔ اسی سوچ کے ساتھ نماز بھی ہوتی رہی۔ نہ جانے کتنی رکعتیں ادا کر ڈالیں۔ دو کی جگہ چار اور چار جگہ دو۔ سلام پھیر کر لا حول پڑھی۔ خیالات کو جھٹکا پھر سے نماز شروع کی، دل لگا کر۔ ایک ایک حرف پر توجہ دی۔ نظریں زمین پر گاڑ دیں، کان بند کر کے خیالات کو صرف اللہ ہی اللہ کے گرد گھمایا۔ سوچا کوئی غلطی ہوگئی تو اب سجدہ سہو کر لوں گی۔ لیکن غلطی کا احساس نہیں ہوا۔ نماز ختم ہوگئی۔ اللہ میاں سے توبہ استغفار کی اور آئندہ توجہ سے نماز سے ادا کرنے کا عہد کیا۔ شیطان سے بچنے کے لئے نفل مانے۔

یوں زندگی دوڑتی بھاگتی رہی۔ اس بھاگ دوڑ میں بچے بڑے ہو گئے اب گھر خالی خالی لگنے لگا، ہر طرف سناٹا تھا۔ لیکن وقت خالی ہاتھ تو نہیں جاتا، بہت کچھ لے بھی جاتا ہے۔ انسان کی صحت، طاقت اور وقت کی آندھی سب کچھ اڑا کر لے گئی۔ جبھی تو عالیہ نے آج وہ دستک سنی جو اس کے دروازے پر بڑی دیر سے ہو رہی تھی اور جسے وہ سنی ان سنی کرتی رہی تھی لیکن آج اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے لگے شیشے پر نظر پڑی اپنی شبیہہ دیکھی۔ اف خدایا میں ایسی ہوگئی ہوں! وہاں اپنا ماضی اور حال صاف نظر آیا۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ واپس آ کر پھر دو نفل پڑھے، اپنی کوتاہی کی معافی مانگی اور سوچا میں کتنی احسان فراموش تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا تو میں نے اس کا شکر صحیح طرح ادا نہ کیا۔ اپنے آپ کو دنیا کے جھمیلوں میں ہی الجھائے رکھا۔ اب وقت ہے اور دل چاہتا ہے نماز کھڑے ہو کر ادا کروں تو کمر میں طاقت نہیں، بیٹھ کر پڑھو تو گھٹنے بے کار۔ یہ سوچ کر اس نے رونا شروع کیا۔ تو کیا اب مجھے لیٹ کر ہی نماز پڑھنی ہوگی۔

اس سب کے باوجود اگر انسان سب کچھ سمجھتا ہو، اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہو، وقت پر کام نہ کرنے کی شرمندگی ہو، احسان فراموشی کا اقرار کرتا ہو......اور پھر اللہ کے حضور رو رو کر دعائیں مانگے تو اللہ تعالیٰ ظالم نہیں، وہ معاف بھی کر دیتا ہے۔

وہ تو ہم سے محبت بھی کرتا ہے، رحم بھی کرتا ہے، درگذر بھی کرتا ہے، معاف بھی کرتا ہے۔ لیکن انسان کے اندر جانتے بوجھتے بھی وہ خشوع وخضوع

فرح وقار

ٹھنڈا چشمہ

کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ وقت کی قدر کیوں نہیں ہوتی۔ شیطان سے دوستی کیوں ہے۔ احسان فراموشی کارویہ اور دنیا میں ہی رہنے کی خواہش..... آخر کیوں؟☆

آج صدیقی ولا برقی قمقموں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ پھولوں کی خوبصورت سجاوٹ سے مزین ہال گوشۂ جنت کی عکاسی کررہا تھا۔ یہ رنگ ونور کی بارش شمیم صدیقی صاحب کے بیٹے فہیم صدیقی کے اعزاز میں تھی۔ فہیم صدیقی نے دیکھتے ہی دیکھتے کاروباری حلقے میں نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔ اپنی ذہانت کے باعث وہ جس پراجیکٹ پر کام شروع کرتا وہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ آج فہیم ایک نمایاں کاروباری شخصیت بن چکا تھا۔

فہیم عادتاً بھی خوش اخلاق اور ہر کسی کی مدد کرنے والا تھا۔ اس نے اپنے کئی دوستوں کی مدد اور معاونت ایسے وقت میں کی جب وہ مشکلات اور مصائب کا شکار تھے اور فہیم کی مالی مدد اور مشوروں نے ان کے کاروبار میں استحکام دیا تھا اور آج وہ نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے تھے بلکہ منافع بخش کاروبار سے ان کی زندگیوں میں آسودگی آچکی تھی۔ کسی نے کوئی بزنس ڈیل کرنی ہو یا نیا پراجیکٹ شروع کرنا ہو، فہیم سے مشورہ ضرور کیا جاتا۔ اور آج فہیم صدیقی کی زندگی کا ایک نیا پراجیکٹ شروع ہونے جارہا تھا۔

حرا، جس کی سہیلیاں اور احباب اس کی قسمت پر رشک کررہے تھے، دلہن بنی فہیم کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ سب لوگ دولہا دلہن کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شادی کی رسموں، تیاریوں، ملبوسات کے چناؤ، میک اپ اور زیورات کی چمک نے خواتین کو کافی مصروف رکھا ہوا تھا۔ غرض ان جھلملاتی روشنیوں میں حرا رخصت ہو کر صدیقی ولا پہنچ گئی۔

ولیمہ کے روز بھی حرا بہت خوبصورت لگ رہی تھی لیکن آج سب کی نگاہوں کا مرکز وہ سونے کا تاج تھا جو فہیم نے اپنی دلہن کو شادی کی رات تحفے میں دیا تھا۔ حرا سونے کا تاج پہنے ہلکے گلابی رنگ کے گاؤن میں کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ سب سے مبارکباد وصول کرتے فہیم اور حرا ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے اور مسکرا دیتے۔

فہیم اور حرا کی شادی حلقہ اثر میں کافی دن تک زیر بحث رہی پھر دعوتوں کے سلسلے شروع ہوئے۔ فہیم کے کچھ دوستوں کی بیویاں تو بلاتے وقت فرمائش کرتیں کہ آپ سونے کا تاج پہن کر ضرور آیئے گا۔ حرا جہاں جاتی ستائشی نظروں سے دیکھی جاتی۔ کسی کے بچے کی سالگرہ ہو یا کوئی اور موقع، فہیم اور حرا مہمان خصوصی ہوتے۔ حرا بھی اپنی خوش گفتاری اور مسکراتے چہرے کے باعث سب کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔

انہی روشنیوں، رنگوں اور پیسے کی چمک دمک سے سجے صبح و شام تیزی سے گذرتے گئے۔ حرا اور فہیم کی زندگی بیٹے کی آمد سے مہک گئی۔ بیٹے کی آمد کی تیاری اور کمرہ سیٹ کرنے میں بھی حرا نے کوئی کمی نہ چھوڑی تاکہ جو بھی دیکھے وہ دیکھتا رہ جائے۔

اس نعمت بھری خوبصورت زندگی کے سحر نے حرا کو احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ کب اس کا شوہر کاروبار میں اوپر تلے نقصان سے سخت پریشان ہے اور نوبت یہاں تک آچکی تھی کہ کمپنی کا دیوالیہ قریب تھا۔ فہیم جو بھی کرتا وہ الٹ ہو جاتا۔ وہ دوست جو اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے فخر محسوس کرتے، آہستہ آہستہ اب نظریں چرانے لگے تھے۔ خاندان والے جو ان سے مشورہ کیے بغیر کچھ کرتے نہ تھے یہ دم بھرنے والے اس مشکل گھڑی میں اجنبی بن چکے تھے۔ ان سب بدلتے حالات

کے لئے حرا بالکل تیار نہ تھی۔ اس کی فرمائشیں اور تقاضے جب مسلسل رد ہونے لگے تو دونوں میں جھگڑے بھی شروع ہو گئے۔

انہی تلخ صبح وشام میں حرا پریشان تھی کہ اپنے دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے کس در کو کھٹکھٹایا جائے۔ اپنے رب اور ہر نعمت دینے والے کو تو یاد کرنے کا ٹائم کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ زندگی کی چکا چوند میں کبھی اس کے آگے سر جھکا لیا اور کبھی اپنی دنیا میں ہی مگن رہی۔ اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی تھی کہ یہ سب بہاریں اس کا فضل ہے۔

ایسے میں شہر کے ایک بزرگ بابا درد کا مداوا نظر آئے۔ بابا کو نذرانے دینے کے بعد ان کے بتائے عمل کرنا شروع کیا۔ بابا نے جو تعویذ دیئے تھے وہ بھی ان کی ہدایت کے مطابق پانی میں گھول کر میاں کو بھی پلائے اور گھر میں بھی رکھے۔ دن گذرتے رہے لیکن حالات میں تبدیلی آتی نہ نظر آئی۔ اب تو حرا کے ذاتی استعمال میں رہنے والی گاڑی بھی بک گئی۔ آہستہ آہستہ حرا کے قیمتی زیورات بھی بکنا شروع ہو گئے۔ حرا کا دل اپنے حالات سے بہت بوجھل تھا۔

آج صبح بھی وہ حسب عادت ناشتے کے ساتھ اپنا پسندیدہ مارننگ شو دیکھ رہی تھی۔ آج کے موضوع نے اسے اور زیادہ متوجہ کر دیا تھا۔ مفتی صاحب خواتین کو ان کے مسائل کا حل بتا رہے تھے۔ کوئی شوہر کی بے وفائی کا غم لیے تھی۔ کوئی سسرال والوں کے مظالم کا رونا رو رہی تھی۔ ایک اولاد کی نافرمانی سے دل گرفتہ تھی۔ آخر میں ایک خاتون نے مسلسل مالی خسارے اور زندگی کے مسائل کا بتایا حرا کو لگا یہ تو اسی کا حسب حال ہے ۔ بہت توجہ سے مفتی صاحب کا جواب سنا۔ مفتی صاحب نے قرآن کی دو تین سورتوں سے مختلف آیات بتائیں اور ان کی تعداد بتائی کہ کتنی بار پڑھنی ہے۔

حرا روزانہ ان آیات کو پابندی سے پڑھنے لگی۔ اب تو چھ ہفتے ہو گئے تھے اور حرا طوطے کی طرح ان آیات کا ورد کرتی۔ دن بدن حرا کی بے صبری اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر میری دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہیں ؟ بے چینی اور اضطراب میں حرا اللہ سے بھی شکوہ کرنے لگتی۔

حرا ان آیات کو اپنی پریشانیوں کے علاج کے طور پر پڑھتی لیکن اس کی زبان اور اس کے دل میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی۔ دعائیہ جملے اس کی زبان سے نکلتے مگر ان کا اثر اس کے دل و دماغ پر نہ پڑتا۔ اس کا جسم، روح اور عقل ان کلمات کا کوئی اثر محسوس نہ کرتی۔ اس کی زبان پر تو دعائیں رہتیں مگر دل دنیا سے ہی متعلق ہوتا۔

آج اپنے گھر کی پرانی ملازمہ سکینہ کو جب اس کے مہینے کے پیسے دیئے اور پھر آئندہ آنے سے منع کیا تو حرا کا اپنا دل بھر آیا۔

''تمہارا گذارا تو مشکل سے ہوتا ہوگا اور اب تو یہاں سے بھی کام ختم ہو گیا ہے تو تمہیں بہت پریشانی ہوگی۔''

حرا نے اپنی مالی پریشانیوں کو محسوس کرتے ہوئے سکینہ سے پوچھا۔

''نہیں اللہ کا شکر ہے گذارا بہت اچھا ہو رہا ہے اور آگے بھی اللہ مالک ہے۔ وہ ایک در بند کرتا ہے تو دوسرا کھول دیتا ہے۔'' اس کے چہرے پر صبر اور شکر آنکھوں میں اللہ پر ایمان اور یقین اور دل میں توکل علی اللہ کا سکون حرا کو جھنجھوڑ گیا۔

حرا نے اپنے دل کو ٹٹولا جو صبر، شکر اور توکل سے بالکل خالی تھا۔ اس نے سکینہ کا بغور جائزہ لیا۔ اس نے تو کبھی اپنی ذات کے علاوہ ادھر اُدھر دیکھا ہی نہیں تھا۔ خالہ سکینہ گھروں میں کام کرنے کے باوجود صاف ستھری اور وقار سے رہنے والی خاتون تھی۔ حرا مزید بے چین ہو گئی ۔

''تم تو بہت سمجھدار ہو'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔'' یہ اللہ پر اتنا مضبوط یقین اور توکل کہاں سے آیا؟''

خالہ سکینہ حرا کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی'' دیکھیں بیگم صاحبہ! رزق کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہے کسی بندے یا مخلوق کے پاس رزق دینے کا اختیار نہیں۔ پھر اس تنگی پر شکوہ کرنا جائز نہیں اور رازق تو اللہ تعالیٰ ہے اس کی مرضی بیگم صاحبہ، کسی کو وہ کھلا دیتا ہے اور کسی کو ناپ تول کر......''

''کہاں سے سیکھیں اتنی سمجھداری کی باتیں؟'' حرا اب بھی حیرت کے سمندر میں تھی۔

''بیگم صاحبہ ویسے تو اللہ کے مجھ پر احسانات ہی احسانات ہیں

لیکن میرے مالک نے میرے اوپر خاص کرم اس وقت کیا جب آپ کے گھر کے قریب ہی ایک گھر میں کام شروع کیا۔ ایک دن بیگم صاحبہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ میں نے کہا نہیں بیگم صاحبہ، ہم غریب لوگوں کو روٹی کی فکر کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ وہ کہنے لگیں چلو پھر آج سے ہم قرآن پڑھنا سیکھتے ہیں کیونکہ ہماری تمام فکروں کا علاج رب کائنات نے اس میں رکھا ہے۔

بس بیگم صاحبہ، اس بات کو تقریباً 3 سال سے زائد ہو گئے ہیں۔ تسنیم باجی روزانہ کام کرنے کے بعد اپنے پاس بٹھا لیتیں اور نورانی قاعدہ سے پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح میں نے آہستہ آہستہ ناظرہ پڑھنا سیکھ لیا۔ اور اب تو اللہ کے فضل سے تسنیم باجی روزانہ ایک آیت پڑھتی ہیں پھر اس کا ترجمہ اور تفسیر بھی سمجھاتی ہیں۔''

حرا کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس نے تو کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ قرآن میں اللہ ہم سے مخاطب ہے۔ وہ تو ہمیشہ اس کو مقدس صحیفے کے طور پر پڑھتی رہی تھی۔

''یہ مصیبتیں ہی دراصل صبر کرنا سکھاتی ہیں اور شکر کرنا بھی۔ اللہ اچھے برے حالات میں ڈال کر ہماری آزمائش کرتا ہے کہ ہم اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں یا بندوں سے امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔''

خالہ سکینہ تو رخصت ہوگئی مگر دو تین روز تک حرا کے دل کی عجیب سی کیفیت رہی۔ آخر کار اس نے بھی سکون اور ہدایت کے اسی سرچشمے سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا۔ اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کیا تو اس کو احساس ہوا کہ نمود و نمائش اور دل کی بیماریوں نے اسے غفلت کی تصویر بنا دیا تھا۔ اس نے غفلت سے بھری زندگی سے توبہ کرنے اور قرآن سے اپنے صبح و شام کو منور کرنے کا عہد کیا۔

اور پھر حرا کو محسوس ہوا کہ گرم ریت پر چل چل کر اس کے پیروں کو جیسے ٹھنڈے پانی کے چشمے مل گئے ہوں...... اس کے جسم کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو سہارا مل گیا ہو!

☆......☆......☆

اسمائے حسنیٰ

اَلْوَلِیُّ اَلْوَالِیُ

نصرت محمود قریشی

اللہ تعالیٰ کے ان دونوں اسمائے حسنہ کا مادہ ولی ہے جسکا مطلب ہے۔ قریب ہونا، متصل ہونا، مخلص دوست ہونا، محب ہونا مددگار ہونا، معاہدہ کنندہ ہونا، حاکم بننا اور فرماں روائی کرنا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں سارے معانی شامل ہیں، ''واللّٰہُ وَلِیُّ المُؤمنین (3:68)'' جو لوگ صرف اللہ تعالیٰ کی باتیں مانتے ہیں اور ان کے ماننے کے نتیجے میں اپنے آپ کو امن میں داخل کر لیتے ہیں یعنی مومنین تو اللہ تعالیٰ ایسے مومنین کے قریب بھی ہے، ان کا مخلص دوست بھی ہے، محب بھی ہے، مددگار بھی ہے ان سے اس نے صرف ایک معاہدہ نہیں بہت سی نعمتوں اور رحمتوں کے وعدے کئے ہوئے ہیں اور حاکم اور فرماں روا تو وہ ہے ہی'' پھر اللہ تعالیٰ نبی کریمؐ سے فرماتا ہے۔ ''اگر تم نے یہود و نصاریٰ کا اتباع کیا تو مَالَکَ مِنْ وَّلِیٍّ وَلَا نصیر (2:120) تمہارا کوئی بھی محب، قریبی ساتھی، مددگار نہیں رہے گا اور مزید براں تمہارے ساتھ اللہ کا جو وعدہ ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ (2-120)'' ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''اگر انہوں نے اللہ کے علاوہ کوئی اور اولیاء (ولی کی جمع) اختیار کرنے کی کوشش کی (تو جان لو کہ انہیں مایوسی ہوگی کیونکہ) اللہ ہی اصل ولی ہے۔ (42:9)''

''الوالیٰ'' کے لئے کہا جاتا ہے'' **المتولی لا موله العالم والخلاق القائم بها وهوا مالک الاشیاء جمیعها المتصرف فیها**'' اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ اس کی ولایت (حاکمیت) کو اس بات سے پہچانا جا سکتا ہے کہ وہ اس دنیا اور تمام عالم کے امور کے لئے کیسی کیسی تدابیر کرتا رہتا ہے، اور اس کی قدرت کے جلوے کیسے کیسے دنیا میں نظر آتے ہیں اور سب چیزوں کا کلی مالک ہونے کی وجہ سے وہ ان میں کیسا کیسا تصرف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس ضمن میں فرماتا ہے ''**مالهم من دونه ولی ولا یشرک فی حکمه احدا**'' (18:26) اس کے علاوہ ان کا کوئی ولی نہیں اور اس کے حکم میں کوئی بھی ساجھے دار نہیں ہو سکتا۔ سو ہمیں ہر دم یہی کہنا چاہیے **نعم المولی و نعم النصیر** (8:40) اور یقین رکھنا چاہیے کہ **هو یتولی الصلحین** (7:196) جو لوگ اپنی اصلاح کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے قریبی دوستی، محبت، مددگار کا رشتہ نبھاتا ہے۔☆

فرحی نعیم

کبھی چاند راہوں میں کھو گیا

اُس نے ہاتھ میں پکڑے اس سنہرے کارڈ کو ایک دفعہ پھر دیکھا۔ آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کارڈ پر گر رہے تھے۔ اُف! کتنی بڑی اذیت تھی جو اس کے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ یہ پہلی دفعہ تو نہیں تھا اور نہ ہی دوسری دفعہ، یہ صدمہ تو وہ تیسری دفعہ اٹھا رہی تھی۔ لیکن اس دفعہ زخم گہرا بھی بہت تھا اور اذیت ناک بھی تبھی تو اس دفعہ تکلیف بھی ناقابل برداشت تھی۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر اس سنہرے کارڈ پر نظر ڈالی انگلی سے اُس پر لکھے اپنے نام پر ہاتھ پھیرا اور پھر اپنے نام سے ذرا نیچے اُس اجنبی نام پر نظر ڈالی جس سے چند ماہ قبل سے ایک انسیت سی ہوگئی تھی اور یہ انسیت ابھی کچھ دیر پہلے تک تھی۔ لیکن ابا جان کی آمد اور انکے الفاظ نے اُس کے اندر کیسی توڑ پھوڑ کر دی تھی۔ اُس نے جلتی آنکھوں سے اس کارڈ کو آخری مرتبہ دیکھا اور ایک جھٹکے سے اس کارڈ کے پہلے دو، پھر چار، اور پھر آٹھ ٹکڑے کر دیئے تھے اور وہ ٹکڑے نفرت سے اچھال کر گھٹنوں میں منہ دے کر سسک سسک کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

وہ چھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ والدین کی لاڈلی اور بہن بھائیوں کی چہیتی۔ سارے ہی بہن بھائی اُس سے بڑی محبت کرتے تھے اور اس محبت سے وہ بڑی مسرور رہتی تھی۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی ابا جان ٹھیکیداری کا کام کرتے۔ گھر میں خوشحالی بھی تھی اور سکون بھی۔ پھر بڑے بھائی کی شادی ہوئی۔ بھابھی آئی گھر میں رونق ہوگئی۔ امی بھی نئی بہو کی دلہنا پے کے ناز اٹھاتیں۔ اور وہ تینوں بہنیں تو تھیں بھابھی کی دیوانی۔ اس کے آگے پیچھے پھرتیں۔ پھر وقت سرکا اور بڑی آپا کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔ بہت سی دعاؤں اور آنسوؤں کے سائے تلے وہ پیا دیس سدھاریں۔ چھوٹے بھیا کی تعلیم مکمل ہوئی تو انہیں امریکہ جانے کا بھوت سوار ہو گیا گھر والوں نے کتنا ہی سمجھایا لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے پھر امی نے اُن کے سامنے ایک شرط رکھ دی وہ باہر تب ہی جا سکتے تھے جب وہ شادی کر لیں گے پھر بیوی کو لے کر جائیں۔ امی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ چھوٹے بھیا تھوڑی پس و پیش کے بعد، یہ شرط ماننے پر تیار ہو گئے اور یوں خاندان سے ہی ایک اچھی لڑکی دیکھ کر امی نے ان کی شادی کر دی اور شادی کے صرف ایک سال بعد ہی وہ بھی امریکہ کو پیارے ہو گئے اور یوں اب گھر میں صرف چھوٹی آپا، فیصل اور وہ خود رہ گئے تھے۔

وقت اپنی سبک خرامی سے گزر رہا تھا تبھی پرسکون وقت کی جھیل میں ہلچل مچی تھی۔ چھوٹی آپا کا ایک رشتہ آیا تھا۔ چلتا ہوا کاروبار تھا۔ لیکن آنے والا رشتہ نہ صرف پہلے سے شادی شدہ تھا بلکہ دو بچوں کا باپ بھی۔ ایک سال پہلے بیوی کسی بیماری میں انتقال کر گئی تھی۔ اور اب بچوں اور گھر کی وجہ سے وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس نے سنا تو غصہ سے پیر پٹختی ماں کے کمرے میں آ گئی جو اپنے تکیوں پر غلاف چڑھا رہی تھیں۔ ملازموں کی موجودگی کے باوجود وہ گھر کے چھوٹے بڑے کئی کام خود ہی کرتی تھیں۔

''امی یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔؟'' وہ ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے کچھ تنک کر بولی تھی۔ ماں نے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے چھوٹی آپا کے لئے جو پیغام آیا ہے فیصل بتا رہا ہے کہ آپ لوگوں نے ان سے سوچنے کا ٹائم لے لیا ہے۔'' اس نے اپنے سے دو سال بڑے فیصل کا نام لیا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہا ہے فیصل۔'' انہوں نے دوبارہ سے غلاف چڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں؟ آپ انکار کیوں نہیں کر دیتیں، چھوٹی آپا کنواری ہیں اور وہ دو بچوں کا باپ۔''

''تم کو اپنی چھوٹی آپا کی عمر معلوم ہے اس سال تیس کی ہو جائے گی۔'' امی بہت سنجیدہ تھیں۔

''ہاں تو کیا تیس کی نا، چالیس کی تو نہیں نا۔'' وہ برہمی سے بولی۔

''عنزہ تمہاری زبان بہت چلنے لگی ہے، کم بولا کرو۔'' وہ بھی ناراضگی سے بولیں۔

''امی آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں، چھوٹی آپا وہاں خوش نہیں رہ سکتیں۔ نئے گھر جاتے ہی دو دو بچوں کی ذمہ داری ان پر ڈال دی جائے گی۔ وہ بیچاری تو......'' عنزہ ہونٹ بھینچ کر بہن کی آنیوالی تکلیف سے پریشان ہو گئی۔

''تمہارا کیا خیال ہے مجھے اور تمہارے ابا کو اس بات کا علم نہیں ہے۔ اور پھر بچیوں کو ان کی دادی، پھوپھی سنبھالتی ہیں، وہ اب بھی کریں گی۔ تم کو زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''چھوٹی آپا تو خاموش ہیں، وہ اس کڑوے گھونٹ کو بھی خاموشی سے پی جائیں گی۔ لیکن میں آپ لوگوں کو یہ زیادتی نہیں کرنے دونگی۔ میں ابا جان سے کہہ کر آپا کی طرف سے منع کر دوں گی۔'' وہ جارحانہ انداز میں بولی۔

''عنزہ، زیادہ بے وقوف نہ بنو۔ تم کیا مستقبل کی پیشن گوئیاں کرنے لگی ہو۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ اس گھر میں خوش نہیں رہے گی۔ کیا پتہ وہ بہت خوش رہے۔ تم اپنے ابا جان سے کچھ نہیں کہوگی۔ تمہارے باپ، بھائی جو بھی فیصلہ کریں گے ہم سب کو اُسے قبول کرنا ہے۔ وہ کوئی ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ جو بھی کریں گے بہت سوچ سمجھ کر ہی کریں گے اور جب صوبیہ کو کوئی اعتراض نہیں تو تم کیوں اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہی ہو۔ دعا کرو خدا اس کو بے شمار خوشیاں دے۔'' امی نے گویا بات ختم کی اور تکیوں کے غلاف سینے کے لئے سوئی میں دھاگہ ڈالنے لگیں۔ وہ چند لمحے ماں کو دیکھتی رہی پھر کچھ بڑا بڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ امی نے عنزہ کے بگڑتے تیور دیکھے اور جھٹکا کر اپنا کام کرنے لگیں۔

اور پھر اس کا احتجاج کچھ کام نہ آیا۔ صوبیہ کے لئے آنے والے رشتے کے لئے ابا اور امی نے ہاں کر دی تھی۔ اس نے صوبیہ کو بھی خوب اکسایا کہ وہ اس رشتے کے لئے صاف انکار کر دے کیونکہ نہ تو ابھی اس کی عمر نکلی ہے اور نہ حسن ماند پڑا ہے۔ لیکن صوبیہ نے شاید خاموش رہنے کی قسم کھالی تھی۔

''کیا پتہ عنزہ میرے مستقبل کے لئے یہی بہتر ہو۔'' وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ بولی۔

''چھوٹی آپا وہ شخص دو بچیوں کا باپ ہے، آپ کو جاتے ہی بچوں کے کاموں میں الجھا دیا جائے گا۔'' عنزہ جھنجھلاتے ہوئے بولی۔

''بچیاں تو شاید سمجھدار ہیں، امی نے بتایا تھا اسکول جاتی ہیں۔''

''ایک تین سال کی اور دوسری پانچ سال کی، اتنے بچے تو بہت سمجھدار اور بردبار ہوتے ہیں۔ کمال ہے آپا آپ نے بھی بے وقوفی کی حد کر دی۔''

''بس عنزہ اب خاموش ہو جاؤ والدین اولاد کا کبھی برا نہیں چاہتے اور والدین کی فرمانبرداری میں ہی دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بول رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے پھر آپ سمیٹیے یہ کامیابی، میں نے خواہ مخواہ سب سے مخالفت مول لی۔ آپ سے تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔'' وہ جل بھن کر بولی اور غصہ سے پاس پڑا میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔ چھ ماہ کے بعد چھوٹی آپا کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ امی شادی کی تیاریوں میں جت گئیں۔ بڑی بھابھی بھی اس کار خیر میں ساتھ تھیں۔ پہلے تو وہ منہ بگاڑے بیٹھی رہی، لیکن کب تک؟ جب چھوٹی آپا سمیت سب ہی راضی خوشی تھے تو ایک اکیلے اس کی ناراض رہنے میں کس کا نقصان تھا بھلا سوائے اس اکیلی ذات کے۔ یوں پھر عنزہ نے بھی تیاریوں میں امی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور پھر چند ماہ کے بعد تو وہ بھی خوش ہی نظر آتی تھی لیکن جیسے جیسے شادی کی تاریخیں نزدیک آ رہی تھیں ایک کسک سی اس کے اندر بھی اٹھتی، وہ خاموشی سے اس کسک کو اندر ہی دبا لیتی مبادا چھوٹی آپا کا دل خراب ہو۔ اُس کا نارمل انداز دیکھ کر اور شادی کی تیاریوں میں

حصہ لینے پر امی نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔

چھوٹی آپا رخصت ہو کر کیا گئیں عنزہ کے لئے تو گھر میں سناٹا ہی چھا گیا ویسے بھی وہ بچپن سے ہی چھوٹی آپا کے نزدیک تھی۔ان کے بغیر تو وہ کچھ اداس ہی ہو گئی تھی۔لیکن پھر چھوٹی آپا کے چہرے کی مسکراہٹ اور پھیلا اطمینان، اس کے لئے بھی اطمینان کا باعث تھا۔ پھر بھی اکثر آپا جب میکہ آتیں وہ کچھ نہ کچھ انہیں جتلا دیتی جس کے بعد چھوٹی آپا خاموش سی ہو جاتیں۔آج بھی وہ دونوں بچیوں کے ساتھ میکہ آئی ہوئی تھیں۔امی، عنزہ، فیصل سب مل کر کھانا کھا رہے تھے۔

''چھوٹی آپا، آپ اُس دن نہیں آئیں، حالانکہ تین فون کئے تھے میں نے آپ کو، چھوٹی خالہ، ماموں دونوں کی پوری فیملی آئی ہوئی تھی۔کہا تھا اگر تھوڑی دیر کو آجاتیں، اتنا مزہ آیا، کتنے مہینوں بعد سب اس دن اس طرح مل بیٹھ کر اکٹھے بیٹھے تھے۔''عنزہ کھانا کھاتے ہوئے شکایتاً بولی۔

''عنزہ میں نے بتایا تو تھا پھر میں کیسے آجاتی۔''

''تھوڑی دیر کو آجاتیں بیٹی۔''اب امی بھی بولیں۔

''امی آپ کو پتہ تو ہے چھٹی کے دن کے علاوہ میرا گھر سے نکلنا مشکل ہے۔دونوں بچیوں کا اسکول، پھر مدرسہ جاتی ہے اقراء، شام میں دونوں کا ہوم ورک۔میرے لئے ممکن نہیں تھا آنا۔''صوبیہ نے اپنی مجبوری بتائی۔

''ہاں ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو، بچوں والیاں تو ایسے ہی گھر میں بند ہو جاتی ہیں۔میں خود، تم بچوں کی پڑھائیوں کی وجہ سے کہیں نہیں آتی جاتی تھی۔تمہاری نانی کے گھر بھی گئے مہینہ ہو جاتا تھا۔''امی نے جیسے جلدی سے بات سنبھالی مبادا بیٹی کا دل برا ہو۔''ہونہہ، بچیوں والی، مانگے کی ذمہ داری۔''عنزہ بڑبڑائی۔جیسے وہاں بیٹھے باقی افراد نے بھی بخوبی سنا تھا۔

''چھوٹی آپا، وہ بچیاں آپ کی ذمہ داری نہیں ہیں۔'' کھانے سے فارغ ہو کر جب دونوں بہنیں کمرے میں آئیں تو عنزہ نے لمحہ بھر کی دیر نہ لگائی اور غصہ سے کھٹاک سے بولی۔

''عنزہ وہ اب میری بھی بیٹیاں ہیں۔''

''اوہو، شادی سے پہلے تو یہ بات آئی تھی کہ بچوں کو دادی پھوپھی سنبھالیں گی۔''عنزہ نے تاک کر طنز کیا۔

''ہاں دادی اب بھی سنبھالتی ہیں لیکن میں اُن کی اب ماں ہوں۔اور ماں کی ذمہ داری زیادہ ہے یا دادی کی؟''وہ اب عنزہ سے پوچھ رہی تھی۔

''لیکن آپ سگی نہیں بلکہ......''

''پلیز عنزہ، ماں، ماں ہوتی ہے سگی، سوتیلی نہیں۔''

''چھوٹی آپا، لگتا ہے کچھ زیادہ ہی برین واشنگ کر دی گئی ہے آپ کی، ان ہی کی حمایت میں بولی جا رہی ہیں آپ تو۔''عنزہ اب کچھ چڑ گئی تھی۔

''تم جو چاہے سمجھو لیکن میں اپنے گھر اور بچوں سے مطمئن ہوں۔''

''یہ منصور بھائی نے خوب آپ کو سبق پڑھا دیئے۔''وہ دانت پر دانت جما کر بولی، اُف عنزہ تم کیوں بچوں والی باتیں کرتی ہو۔منصور بہت اچھے ہیں، میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔مجھے انہوں نے کبھی بھی، کہیں جانے سے نہیں روکا، میں تو خود ہی، پھر بچیاں بھی بہت سلجھی ہوئی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، آپ میں تھا بہت حوصلہ جو آپ نے امی، ابا کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ورنہ ہو سکتا تھا کہ اس کے بعد کوئی اور اچھا رشتہ آتا اور وہ کنوارا ہوتا۔''اس نے کنوارے پر زور دیا۔''تب آپ پر یہ دہری ذمہ داری تو نہ پڑتی۔آپ تو منصور بھائی کے ساتھ بھی بڑے جلدی ایڈ جسٹ ہو گئیں۔اگر آپ کی جگہ خدانخواستہ میں ہوتی نا، صاف انکار کر دیتی، خوب شور کرتی، امی ابا کو تو منع کرتے ہی بنتی۔''عنزہ کچھ جتا کر بولی۔

''عنزہ میری جان، یہ وقت اور حالات جو ہوتے ہیں نا یہ کسی کے نہیں ہوتے اور نہ ہی کوئی اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ کہہ سکتا ہے۔خدا کرے تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہ ہو۔لیکن ایسے دعویٰ بھی نہیں

کرنا چاہیے۔'' چھوٹی آپا پھیکی ہنسی ہنسیں۔

'' آپ دیکھ لیجئے گا، وہی ہوگا جو میں چاہوں گی یہ بچوں کی ذمہ داریاں آپ ہی کو مبارک ہوں۔ ہم اپنا نصیب خود ہی بناتے ہیں۔ اگر آپ امی کو منع کر دیتیں تو کیا پھر بھی آپ کی شادی یہاں ہوتی ؟ کوئی زبردستی تھوڑی کر سکتا تھا آپ کے ساتھ، لیکن آپ نے تو خود ہی ہتھیار پھینک دیئے تھے۔''

''اچھا اب ان باتوں کا فائدہ! تم پر آج پھر پہلے والا دورہ پڑا ہے۔ بس یہی میرا نصیب تھا جو مجھے ملا۔ تم اس موضوع کو بھلا کیوں نہیں دیتیں۔'' آج تو صوبیہ بھی جھنجھلا گئی تھی۔

''یہ بھی خوب رہی کہ جب کچھ بس میں نہیں ہوتا تو نصیب پر ڈال کر اپنے آپ کو مطمئن کر لو تو یہی میرا نصیب، یہی میری قسمت ۔ ہونہہ۔''

''عنزہ بس کچھ ہی مہینوں کی بات ہے پھر تمہاری بھی شادی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا پھر تم خوب اپنی من مانی کر لینا۔ اب مجھے تو بخش دو۔'' صوبیہ باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''بالکل بالکل دیکھئے گا، میں کیسے کیا کروں گی، آپ کی طرح کم از کم کبھی نہیں کروں گی۔'' اتنی دیر میں دونوں بچے صوبیہ کے پاس آگئے تھے تو وہ ان میں لگ گئی اور عنزہ کچھ سوچتے ہوئے صوبیہ اور دونوں بچیوں کو غور سے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

سال بھر میں صوبیہ خود بھی ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ منصور بھائی نے اس بچی کی بڑے شاندار طریقے سے عنزہ کے گھر والوں اور دوسرے خاندان والوں کی عقیقہ کی دعوت کی۔ مٹھائی بانٹی۔ صوبیہ کے سسرال والوں نے بھی اس کے بڑے چاؤ کئے۔ صوبیہ بہت خوش اور مطمئن تھی پھر خوشحالی بھی تھی دونوں بچیاں بھی ننھی بہن کی آمد سے مسرور تھیں۔ صوبیہ ایک ہفتہ ماں کے گھر آ کر رہی، بڑی بچیاں اپنی دادی کے پاس تھیں۔ صوبیہ کے چہرے کی مسکراہٹ اگرچہ عنزہ کے لئے بھی اطمینان بخش تھی لیکن پھر بھی وہ دل ہی دل میں یہ ضرور سوچتی کہ بہن پر ایک نہیں بلکہ اب تین بچوں کی ذمہ داری ہے۔ نہ جانے یہ کیسی چبھن تھی جو وقفہ وقفہ سے اسے تکلیف ہی دیتی رہی۔ اسے ایسا لگتا کہ اس کی بہن کے ساتھ گھر والوں نے انجانے میں زیادتی کر دی ہے۔ نادان تھی نا جو قسمت کے لکھے کو نہیں سمجھتی تھی۔

☆......☆......☆

صبح و شام اپنی رفتار سے گزر رہے تھے۔ اس کے لئے بھی رشتے آ رہے تھے۔ ابا نے ایک رشتہ مناسب سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایک شام رشتہ داروں کو بلا کر منگنی کی تقریب کر دی گئی اور اس نے ایاز کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ لیکن ابھی منگنی کو چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ کہ رشتہ دار کے توسط سے ابا کو علم ہوا کہ ایاز کی صحبت اچھی نہیں اور پھر اس کا مزاج ایسا ہے کہ وہ جم کر کہیں نوکری نہیں کرتا ہر جگہ دو تین ماہ بعد وہ نوکری چھوڑ کر آ جاتا ہے پھر کئی کئی ماہ بے روزگار رہتا ہے۔ مزاج کی گرمی اسے لگ کر کہیں نوکری ہی نہیں کرنے دیتی۔ ابا نے بیٹوں سے مشورہ کیا اور منگنی ختم کر دی۔ ان کو ایسا داماد نہیں چاہیے تھا جو ان کی بیٹی کو پریشان ہی رکھے۔ عنزہ کے دل میں بھی کچھ ٹوٹا لیکن ماں اور بہن کی باتوں سے ان کے دیئے حوصلے سے وہ جلد ہی سنبھل گئی۔ چند ماہ یونہی گزر گئے پھر اس کے بعد اس کے لئے ایک اور پیام آیا لڑکا جرمنی میں کسی فرم میں انجینئر تھا۔ ابا نے اپنے جاننے والوں کے توسط سے چھان بین کرائی۔ اگرچہ امی اسے اتنی دور بھیجنا نہیں چاہتی تھیں لیکن ابا اور بھائیوں کے پاس 'سب اچھا' کی رپورٹ آئی تھی۔ یوں اس کو فراز کے نام سے جوڑ دیا گیا اور وہ جرمنی جانے کے خواب بننے لگی۔ امی نے اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ جہیز تو ایسا کوئی بنانا نہیں تھا کہ اس نے شادی کے بعد جرمنی ہی چلے جانا تھا بس کچھ خاص خریداری کرنا تھی۔ لیکن ایک دن یہ خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔ فراز کی والدہ اپنی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ بڑی شرمندہ شرمندہ آئی تھیں اور ابا، امی کے ساتھ معذرت خواہانہ انداز میں بات کر رہی تھیں۔

''بہن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیسے کہوں، اصل میں فراز نے جرمنی میں آج سے چار سال پہلے شادی کر لی تھی۔ بیوی اس

کی عیسائی ہے۔ دو بچے بھی ہیں۔ ایک سال پہلے، اس کی بیوی اس کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بچے بھی ساتھ لے لئے تھے پھر فراز نے اسے منانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ نہ آئی۔ پھر ہم نے اس پر زور دیا کہ تم اس کو چھوڑ دو اور یہاں کسی مسلمان، پاکستانی لڑکی سے شادی کرو۔ بڑی مشکلوں سے وہ مانا تو ہم نے آپ کی بیٹی سے بات طے کی اب جبکہ ہم بھی شادی کی تیاریوں میں تھے اور فراز بھی ملک آنے کے لئے چھٹی لے رہا تھا کہ وہ عورت اچانک واپس آ گئی اور فراز کے ساتھ رہنے پر راضی ہے۔ ہم نے فراز سے کہا کہ اسے طلاق دے دو لیکن اب وہ کہتا ہے کہ وہاں کے قانون کے مطابق یہ بہت مشکل ہے پھر یہ بھی کہ اس کے بچے رل جائیں گے اور وہ عورت ان بچوں کو بھی عیسائی بنا دے گی۔ چنانچہ......'' فراز کی والدہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئیں اور انہوں نے بات بڑھانے کے لئے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

''آنٹی ہم سب آپ سے بے حد شرمندہ ہیں لیکن کیا کریں مجبور بھی ہیں، دیکھیں ہم آپ سے کوئی بات نہیں چھپا رہے سب صاف صاف بتا رہے ہیں فراز نے بھی بہت معذرت کی ہے اور ہم بھی آپ سے معذرت کر رہے ہیں کیا کریں اگر ہم فراز کے ساتھ زبردستی کریں گے تو پھر کہیں آپ کی بیٹی کی ہی زندگی نہ خراب ہو جائے۔ اچھا ہے شادی سے پہلے ہی بات سامنے آ گئی۔ ابھی تو صرف منگنی ہی ٹوٹی ہے خدانخواستہ اگر نکاح کے بعد ہوتا تو پھر تو بہت برا ہوتا عزہ کے ساتھ۔'' فراز کی بہن کہہ رہی تھی اور پھر انہوں نے امی ابا کی طرف سے دیا گیا سامان واپس کر دیا۔ امی کیا کہتیں۔ بات تو ٹھیک ہی تھی اگر نکاح کے بعد فراز کی حقیقت کا پتہ چلتا تو وہ کیا کر سکتی تھیں؟ اور اب بھی اگر وہ فراز پر دباؤ ڈالیں شادی کے لئے تو ان کی بیٹی کی ہی زندگی خراب ہونی تھی۔ تو پھر فراز کی بہن کے بقول منگنی ختم ہونا ہی اچھا ہے۔ لیکن یہ پہلی دفعہ تو منگنی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ جو انہیں زیادہ دکھ نہ ہوتا یہ صدمہ تو وہ لوگ دوسری دفعہ اٹھا رہے تھے۔ اور اس منگنی کے ختم ہونے کا دکھ عزہ سے زیادہ امی کو تھا۔ اس کے بعد تو وہ بستر کی ہو گئی تھیں۔ اپنی سب سے زیادہ چہیتی بیٹی کا دکھ انہیں دل کا درد دے گیا تھا۔ عزہ اگرچہ چند مہینوں بعد سنبھل گئی تھی لیکن امی نہ سنبھل پائیں اور ایک دن انہیں ایسا اٹیک آیا کہ وہ اپنے خالق سے جاملیں۔

امی کی جدائی تو نہ صرف عزہ کو بلکہ سارے گھر والوں کو توڑنے کے لئے کافی تھی۔ ابا کو بھی چپ لگ گئی تھی اور عزہ تو جیسے ساری دنیا سے کٹ کر اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھی۔ بہنیں آتیں تو وہ کچھ ہنس بول لیتی ورنہ اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی ساری شوخی اور شرارت تو جیسے اس کی ماں کے ساتھ ہی روٹھ گئی تھی۔ وقت کا پنچھی اپنی رفتار سے اڑا جا رہا تھا۔ زندگی نے اسے دو چرکے دیئے تھے اور ابھی چند اور اس کے منتظر تھے۔

☆......☆......☆

اس دفعہ بڑی آپا کے توسط سے ایک پیغام آیا تھا۔ لڑکا یہیں کسی آفس میں ملازمت کرتا تھا۔ گھر والوں نے چھان بین کر کے پیغام منظور کر لیا تھا۔ اس دفعہ گھر والوں کی متفقہ رائے تھی کہ منگنی کے بجائے براہ راست شادی کی جائے گی۔ ابا کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ عزہ کو منگنی راس نہیں آتی۔ لہٰذا چار ماہ بعد شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی امی تو اب ہی نہ تھیں بہنیں اور بھابھیاں ہی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ بھی بے دلی سے ان تیاریوں میں شریک تھی۔ شادی میں صرف ایک ماہ رہ گیا تھا۔ کارڈ بھی چھپ کر آ گئے تھے کہ وہ ہو گیا جس کا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ابا، بھائی کے ساتھ کیٹرنگ کی دکان پر جا رہے تھے کہ عزہ کی ہونے والی سسرال سے فون آیا تھا۔ ابا کو فوری بلایا تھا۔ ابا پریشان ہو گئے تھے۔ بھائی نے پھر یہی بہتر سمجھا کہ پہلے سسرال چلا جائے اور پھر وہاں جا کر جو بات چیت ہوئی وہ ابا اور بھائی کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔

☆......☆......☆

آج بڑی اور چھوٹی آپا آئی ہوئی تھیں۔ تیاریوں کو دیکھا جا رہا تھا۔ کپڑا، زیور، جوتے، کراکری وغیرہ۔ ابا نے آج خاص طور پر دونوں بڑی بیٹیوں کو بلایا تھا کہ آ کر دیکھ لیں تیاریاں مکمل ہو گئیں یا ابھی کچھ رہ گیا اور جو کچھ رہ گیا ہو اس کی لسٹ بنا لی جائے۔ ابا، اپنی چہیتی کی شادی

میں کہیں کوئی کمی نہ رہنے دینا چاہ رہے تھے امی کے بعد تو انہیں عنزہ سے زیادہ ہی محبت ہوگئی تھی ۔ وہ خیال بھی تو کتنا رکھتی تھی ۔ باپ کا ، انہیں چھوٹی سی چھوٹی ضرورت بھی ہوتی تو باپ کے پاس دوڑ کر جاتی ۔ ان کی دوا، کھانے پینے ، کپڑوں کا خیال اب وہی تو رکھتی تھی ۔ وہ اگلے گھر کے لئے بیٹی کی ضرورت کی ہر شے مہیا کر دینا چاہتے تھے ۔لیکن آج ، آج جو کچھ عنزہ کے سسرال والوں نے کہا تھا وہ انہیں توڑ دینے کے لئے کافی تھا۔ عنزہ کے سسرال والے کچھ لالچی تھے یہ اندازہ تو انہیں بات طے ہونے کے بعد ہو ہی گیا تھا لیکن وہ اتنے حریص اور لالچ میں اندھے ہو جائیں گے یہ انہیں آج ہی معلوم ہوا تھا لڑکے کے بھائی اور والد نے انہیں بلا کر ایک فلیٹ کا مطالبہ کیا تھا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی تھی کہ وہ اپنے منجھلے بیٹے سے جو کہ امریکہ میں مقیم تھا کہہ کر اسکے لئے ایک اچھی جاب کا بندوبست کریں یا کم از کم اسے اپنے خرچے پر وزٹ ویزا پر امریکہ بلوا لیں اور اس کے پاسپورٹ اور ویزا کے لئے بھی کوشش کریں ۔ ابا اگر چاہتے تو یہ سب کر سکتے تھے لیکن ان کی دور اندیش نظروں نے ان لوگوں کے اندر بھرے ہوئے حرص کو پہچان لیا تھا اور وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ سلسلہ جو آج شروع ہوا ہے وہ کبھی رکے گا نہیں اور آج تو وہ کر لیں گے کل کو جب وہ نہیں ہونگے تو ان کی لاڈلی کو تو یہ لوگ کہیں کا نہ چھوڑیں گے ۔ بھائی بھی کب تک مطالبات پورے کریں گے ۔ انہوں نے فیصلہ کرنے میں زیادہ وقت نہ لیا تھا اور ساتھ بیٹھے بیٹے سے چند لمحہ بات کر کے انہوں نے اس شادی سے انکار کر دیا تھا ۔لڑکے والوں کو شاید ابا کے اس اقدام کی بالکل بھی امید نہ تھی وہ تو شادی سے قریب وقت کا انتظار اسی لئے تو کر رہے تھے کہ اب ابا کے پاس اقرار کے سوا کسی بات کی گنجائش نہ رہے گی اور ان کی شرائط انہیں ماننی ہی پڑیں گی وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ابا انتہائی قدم بھی اٹھا سکتے ہیں ۔ بھائی تو خود ابا کے اس فیصلہ پر ہکا بکا رہ گئے تھے وہ چاہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو کسی طرح سمجھا لیا جائے لیکن ابا ایک حرفی لفظ کہہ کر وہاں سے اٹھ آئے تھے ۔ گھر آئے تو دونوں بیٹیاں فہرست لئے بیٹھی تھیں ۔ بچوں کا شور صحن میں گونج رہا تھا ۔ بھابھی چائے کے ساتھ مختلف لوازمات سجائے ہنسی مذاق کر رہی تھیں ۔ شادی والے گھر مخصوص رونق تھی جو گھر بھر میں محسوس کی جا سکتی تھی ۔

''السلام علیکم ابا آپ لوگ آ گئے ، دیکھیں یہ میں نے فہرست بنالی ہے ۔بس چند ہی چیزیں رہ گئی ہیں ۔ ٹی وی ، فریج ، واشنگ مشین تو فیصل کے دوست کی دکان سے آ جائے گا ۔ اس کا تو مسئلہ نہیں ۔ اب یہ جو جیولر ہے اس کے......''

''بیٹے ان چیزوں کو فی الحال رہنے دو۔'' ابا نے بڑی بیٹی کی بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''رہنے دیں ؟ کیا مطلب ؟'' وہ حیرانگی سے پوچھ رہی تھیں اور جواب میں بھائی نے جو کچھ کہا وہ ان سب کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھے ۔تینوں کے آنسو بے اختیار ہی بہنے لگے تھے ۔ یہ کیا ہو گیا تھا ؟ یہ کیا ہونے جا رہا تھا ؟

''ابا ، ابا ، عنزہ ، عنزہ تو......'' چھوٹی آپا اپنے آنسو پونچھتی ہوئے بولیں لیکن بول نہ پائیں ۔

''ہم عنزہ کو کیسے یہ سب بتائیں گے ، وہ تو مر جائے گی ۔'' بھابھی بھی سرخ آنکھوں سے بولیں ۔

''ابا کیا کوئی بیچ کی راہ نہیں نکل سکتی ، ایک دفعہ پھر اس کے ساتھ یہ حادثہ ہو ، وہ کیسے سہہ پائے گی ۔'' بڑی آپا بھی حد درجہ پریشان ہوگئی تھیں ویسے بھی یہ رشتہ ان کے ہی توسط سے آیا تھا ۔'' پہلے دو منگنیاں اور اب شادی ، جبکہ صرف ایک ماہ رہ گیا ہو ۔''

''کتنے کارڈ بھی بٹ چکے ۔'' بھائی کے لہجے میں بھی حد درجہ فکر مندی تھی ۔

''ابا ، ابا ، آپ بھی تو کچھ کہیں ۔'' بڑی آپا آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بولیں ۔

''بیٹا تم کیا نہیں جانتی مجھے عنزہ سے کتنی محبت ہے ، لیکن میں نے جو کچھ کیا وہ اس کے بہتر مستقبل کے لئے ہی کیا ہے ۔ آج کی چند روزہ پریشانی آئندہ آنے والی زندگی کی مسلسل پریشانیوں سے تھوڑی بھی ہے اور بہتر بھی ۔ میں خود اپنی بچی کو بتا دوں گا ۔ وہ بہت حوصلہ مند ہے اور اپنی

ماں کے بعد تو اس میں سمجھداری، برداشت، حوصلہ سب بہت زیادہ ہوگیا۔ وہ بہت بدل چکی ہے وہ یقیناً میری بات سمجھ جائے گی۔'' ابا تھکے تھکے لہجے میں یہ سب کہہ رہے تھے ان کی آنکھیں اور سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ بھی یقیناً عنزہ کی اس تکلیف کو محسوس کر رہے تھے جو اس خبر کو سننے کے بعد اس کو ہوتی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس کے کمرے کی طرف بڑھے اور انہوں نے مختصر الفاظ میں اسے ساری صورتحال بیان کی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر وہ چاہے تو وہ اپنے اس فیصلہ کو بدل دیں گے لیکن عنزہ نے ہچکیوں کے درمیان ان کے فیصلے کو قبول کرلیا تھا۔ ساری رات اسے یوں لگتا رہا کہ پھٹے ہوئے کارڈ کے سارے پرزے اس کے گرد رقصاں قہقہے لگا رہے ہیں۔ اسے اماں کی بہت یاد آئی اور وہ دیر تک روتی رہی۔

☆......☆......☆

جس نے سنا وہ حیران تھا۔ سارا خاندان ہی عنزہ کی قسمت کو مختلف نام دے رہا تھا۔ دونوں بہنیں بھائی اسے حوصلہ تسلی دے رہے تھے۔

''شاید اسی میں تمہاری بہتری ہوگی عنزہ۔'' چھوٹی آپا اس کے پاس بیٹھی اسکا ہاتھ اور سر سہلاتے ہوئے بولیں۔

''شاید کیوں یقیناً، ہماری بہن کے مقدر میں اس سے اچھا لڑکا ہوگا تبھی تو اللہ نے ان لالچی لوگوں سے بچالیا۔'' بڑی آپا بھی بولیں۔

''بس آپا، اب کوئی اس گھر میں میری شادی کا نام نہیں لے گا۔ جو ہوگیا اسے میں نے قبول کرلیا۔ اب آپ لوگ فیصل کے لئے لڑکی ڈھونڈیں اور اس کی شادی کریں، اس کی عمر بھی اب کافی ہوگئی اور میری بات آپ ابا تک بھی پہنچادیں۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ ویسے بھی ابا کو میری ضرورت ہے۔'' عنزہ انتہائی سنجیدگی اور قطعی انداز میں بولی۔ آپا نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی اور پھر کئی موسم آئے اور گزر گئے۔ ابا بھی امی کے پیچھے ایک رات خاموشی سے چلے گئے۔ گھر والوں کے بے حد اصرار پر بھی عنزہ نے جیسے اب شادی نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔ پھر جیسے سب ہی تھک ہار کر خاموش ہوگئے۔

فیصل کی بھی شادی ہوگئی۔ اب گھر میں دونوں بھابھیاں اور وہ تھے۔ وہ بھابیوں کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتی تھی لہٰذا ان دونوں کو بھی اس کے بے ضرر وجود سے کوئی مسئلہ نہ تھا ویسے بھی اس نے وقت گزاری کے لئے گھر سے قریب ایک اسکول میں جاب کرلی تھی۔ یوں آدھا دن تو اس کا وہیں گزر جاتا۔ زندگی اسی طرح رواں دواں تھی کہ ایک دن چھوٹی آپا کے پاس امریکہ والے منجھلے بھیا کا فون آیا۔

''اور عنزہ کا روٹین کیا ہے جاب چل رہی ہے؟ میں نے سوچا عنزہ تم سے زیادہ قریب ہے اس لئے پہلے تم سے ہی بات کروں۔'' سلام دعا، خیر خیریت کے بعد وہ مطلب کی بات پر آئے تو صوبیہ بھی چونک گئیں۔

''جی بھیا، خیریت ہے، کیسی بات۔''

''اصل میں یہاں میرا ایک دوست ہے پچھلے کئی سال سے ہماری دوستی ہے، پچھلے دنوں اس کے بڑے بھائی یہاں اپنے کام کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اچھے سمجھدار اور خوش اخلاق ہیں۔'' بھیا بول رہے تھے اور صوبیہ ناسمجھی سے ہوں، ہاں کر رہی تھیں وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے وہ سمجھ نہیں پائی تھیں۔ ''بیوی کا کئی سال پہلے انتقال ہوچکا ہے۔ دو بیٹے ہیں ایک چودہ سال کا اور دوسرا بارہ سال کا، اصل میں وہ اب دوسری شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں میں نے انہیں عنزہ کا بتایا اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بھی بتایا اور عنزہ کا رشتہ بھی دیا۔ حسن بھائی نے عنزہ کو قبول کرلیا ہے۔ تم عنزہ کو بتادو میں نے یہاں اس کی بات طے کردی۔ حسن بھائی دو ہفتے اور یہاں قیام کریں گے۔ پھر واپس ملک آجائیں گے پھر تم لوگ ان کے گھر جا کر باقی باتیں بھی فائنل کرلینا۔ ابا تو اب رہے نہیں ہمیں ہی عنزہ کے بارے میں سوچنا ہے اور حسن بھائی ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔''

بھیا بولے جا رہے تھے اور صوبیہ کے تو جیسے آواز ہی حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ بھیا نے تو بالا ہی بالا سارے معاملات طے کر دیئے تھے اور ان لوگوں کو صرف اطلاع دے رہے تھے بھیا نے اپنی بات ختم کی اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا اور صوبیہ کے اوپر سارا بوجھ ڈال دیا۔ اور صوبیہ تو کتنی ہی دیر اپنا سر تھامے بیٹھی رہیں پھر انہوں نے فوراً

بڑے بھائی اور بڑی آپا کوفون گھمایا سب ہی یہ سن کر گویا پریشان ہو گئے تھے اور اب صوبیہ پر ہی ساری ذمہ داری ڈال دی گئی تھی کہ وہ عنزہ سے بات کرے اور اسے راضی کرے۔ اگلے دن اس پہاڑ کو سر کرنے صوبیہ عنزہ کے سامنے بیٹھی وہ الفاظ سوچ رہی تھیں جو وہ عنزہ کے سامنے کہہ سکیں۔ اور ابھی وہ سوچ ہی رہیں تھیں کہ عنزہ نے ان کی یہ مشکل خود ہی آسان کر دی۔

''چھوٹی آپا آپ جو کچھ کہنے آئی ہیں وہ اتفاق سے میں نے رات کو بھائی کے منہ سے سن لیا جب وہ بھابھی سے کہہ رہے تھے۔''

''کیا؟ کیا مطلب؟'' صوبیہ بُری طرح گڑبڑا گئیں۔

''یہی کہ بھیا نے بغیر کسی سے مشورہ کئے اپنے دوست کے بھائی کے ساتھ......'' عنزہ کے اچانک ہی حلق میں گولا سا پھنسا تھا باقی بات اس کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ اس نے رخ موڑ کر اپنے آپ کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ دوسری طرف صوبیہ کے سینہ سے کب سے دبی وہ سانس خارج ہوئی اور وہ اپنے آپ کو ایکدم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگیں۔ کتنا مشکل کام تھا جو خود بخود حل ہو گیا تھا۔

''پھر......پھر تم نے کیا سوچا؟'' صوبیہ نے دھیرے سے اس کی پشت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سوچنے کے لئے بھیا نے چھوڑا ہی کب ہے'' وہ دھیرے سے پھیکی ہنسی ہنسی۔ ''چھوٹی آپا میں رات سے یہ سوچ رہی تھی کہ منصور بھائی کا رشتہ جب آپ کے لئے آیا تھا تو میں نے کتنا اعتراض کیا تھا۔ امی سے لڑی آپ کو اکسایا لیکن......اور آپ کو یاد ہے آپ نے کہا تھا کہ وقت اور حالات کسی کے نہیں ہوتے اور ہم قبل از وقت کبھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور اب میں نے بھی یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ میں پوری رات سوئی نہیں، ساری رات ابا کا کہا جملہ ہی میری دل و دماغ میں گونجتا رہا کہ ''وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کبھی کسی کو نہیں ملتا'' اور میں نصیب پر شاکر ہو چکی ہوں۔'' وہ تھکی تھکی آواز میں بولی اور آنکھیں بند کر لیں۔

صوبیہ خاموش بیٹھی کتنی ہی دیر کچھ کہنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پھر خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی یہ سوچتے ہوئے کہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی عنزہ......ہم دونوں بہنوں کے نصیب میں جو تھا وہ آخر کار ہمیں مل کر رہا۔ وقت اور حالات کب، کس کے ساتھ کیا ہو جائیں یہ ہم کیسے جان سکتے ہیں اور نصیب سے کون لڑ سکا ہے۔ عنزہ کو بھی آخر کار وہی ملا جو مجھے کئی سال پہلے ملا۔ یہ تقدیر کے فیصلے ہیں جو دور آسمانوں میں ہوتے ہیں اور ان میں تبدیلی کسی انسان کے بس میں نہیں۔

☆......☆......☆

مجھے گھر جانا ہے (۴)

دوسرے دن صبح ناشتہ کرنے کے بعد ہم ٹورنٹو سے بذریعہ کار مونٹریال کیلئے روانہ ہوئے۔ سفر بے حد آرام دہ رہا۔ سڑکیں ہموار اور کشادہ ہیں۔ ٹریفک منظم ہے۔ دائیں بائیں کھلے میدان ہیں یا آسمان سے باتیں کرتے ہوئے بلند و بالا سیاہی مائل سبز پتوں والے توانا درخت۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ سب درختوں کے تنے بالکل سیدھے ہیں۔ گویا وہ بھی کسی نظم و ضبط کے پابند ہیں۔ چونکہ گرمی کا موسم ہے اس لئے رنگ برنگے حسین پھول جا بجا اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔ اچانک میری نظر آسمان کی طرف اٹھی اور پھر وہیں اٹک گئی۔ آسمان کے جاذبِ نظر نیلے رنگ نے مجھے مبہوت کر دیا۔ ایسی وسیع و عریض، بے کنار، دلکش، نیلگوں آسمانی چادر بہت عرصہ کے بعد دیکھی۔ ہمارے ہاں چونکہ فضا میں گرد و غبار کی موٹی تہہ معلق رہتی ہے، اس لئے آسمان کا رنگ واضح نظر نہیں آتا بلکہ کسی حد تک ملگجا سا نیلا دکھائی دیتا ہے۔ پھر بڑے شہروں میں فلک شگاف عمارتیں آسمان کے بھرپور نظارے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہیں۔ اس لئے آسمان کی کشادگی اور وسعت کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ کھلی جگہوں پر آسمان کو دیکھنے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔

کینیڈا جھیلوں اور جنگلات سے گھرا ہوا ہے۔ ایک دن گھر سے قریب ایک جھیل پر جانے کا پروگرام بن گیا۔ کھانے پینے اور بچوں کے کھیلنے کا کچھ سامان لیا اور نکل پڑے۔ چونکہ چھٹی کا دن ہے اس لئے وہاں بہت سے خاندان سیر و تفریح کیلئے آئے ہوئے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لکڑی کے بے شمار میز اور بنچ رکھے گئے ہیں۔ جہاں آپ بے فکری سے اپنا سامان رکھ کر سستا سکتے ہیں۔ بیٹھ کر گپ شپ کر سکتے ہیں۔ پڑھنا لکھنا چاہیں تو ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ کھانا پینا چاہیں تو بھی ان کی وجہ سے سہولت حاصل کر سکتے ہیں۔ ذرا سے فاصلے پر صاف ستھرے غسلخانے ہیں۔ جہاں ٹھنڈا اور گرم پانی، صابن اور ٹشو پیپر دستیاب ہیں۔ فٹ بال، بیس بال، ہاکی اور ٹینس وغیرہ کھیلنے کیلئے کورٹ بنائے گئے ہیں۔ اگر آپ فٹ بال ساتھ لانا بھول گئے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ یہاں سے فٹ بال بھی مل جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ واپسی پر لوٹا کر جائیں۔

زمین پر تا حدِ نظر سبز گھاس کا قالین بچھا ہوا ہے۔ جگہ جگہ خوبصورت پھول کھلے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈسٹ بن رکھے ہوئے ہیں۔ صفائی ایسی ہے کہ خواب کا گماں ہوتا ہے۔ جھیل کا پانی بھی ایسا شفاف ہے جیسے فلٹر میں سے چھن کر آ رہا ہو۔ مرغابیاں اور دور سے کئی پرندے بے خوف و خطر لوگوں کے آس پاس چل پھر رہے ہیں۔ یہاں پرندوں کو دانہ وغیرہ ڈالنے کی اجازت نہیں۔ آپ ان کو دیکھ کر دل بہلا سکتے ہیں، ان کو پیار سے چھو سکتے ہیں، ان کے حسن کی تعریف کر سکتے ہیں لیکن انہیں کھانے کیلئے کچھ نہیں دے سکتے کیونکہ تحقیق کرنے کے بعد یہ لوگ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر پرندوں کو کچھ عرصہ تک کھانا مہیا کیا جائے تو وہ آہستہ آہستہ اس قدر تن آسان ہو جاتے ہیں کہ کھانے کی تلاش ترک کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جب انہیں آسانی سے کھانا نہیں ملتا تو وہ اڑان بھر کر اسے تلاش کرنے کی بجائے بھوک سے مر جاتے ہیں۔

کچھ لوگ مچھلی پکڑنے کا سامان ساتھ لائے ہیں۔ وہ ڈوری کو پانی میں ڈال کر منتظر بیٹھے ہیں کہ کب ڈوری ہلے اور وہ اسے اوپر کھینچ کر گوہرِ مقصود حاصل کریں۔ جھیل میں قوی الجثہ بھاری بھرکم پتھر قدرے کم گہرے پانی میں پڑے ہیں۔ کچھ لوگ ان پر چڑھ کر بیٹھے ہیں اور تصویریں بنوا رہے ہیں۔ کچھ لوگ کناروں پر بیٹھ کر اپنے پاؤں پانی میں لٹکا کر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کچھ بچے کناروں سے پتھر چن کر پوری قوت سے پانی میں پھینک رہے ہیں۔ کچھ بچے جھیل کے کنارے ریت

کے گھروندے بنانے میں مصروف ہیں تو کچھ بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ کچھ سیپیاں یکجا کررہے ہیں تو کچھ مختلف رنگوں اور اشکال کے چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ یہاں بچوں اور بڑوں کی سواری کیلئے ڈھیروں سائیکلیں رکھی گئی ہیں۔ کچھ بچے یہ سائیکلیں لے کران کی سواری سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کچھ کھانے پینے میں مصروف ہیں۔

میں حیرت اور حسرت کے ساتھ سب کو دیکھتی چلی جاتی ہوں کہ سب لوگ کیسے سکون کے ساتھ اپنی اپنی پسندیدہ مصروفیت میں محو ہیں۔ انہیں بدنظمی کا خوف ہے نہ فسادات کا خوف۔ لٹنے کا خوف نہ پٹنے کا خوف۔امن کے بارے میں خوف نہ چمن کا خوف۔ یہ سوچ کر میرے دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے کہ میرے ملک میں ایسا سویرا کب ہوگا کہ عام عوام بھی بے شمار قسم کے چھوٹے چھوٹے خوف اور فکروں سے آزاد ہو جائیں گے۔ وہ خوف جو ہر وقت ہمارے ذہنوں پر چھائے رہتے ہیں۔ جو ہمیں اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیتے ہیں اور یوں ہم زندگی کو بسر نہیں کرتے بلکہ زندگی ہمیں روند کر گزر جاتی ہے۔

یہاں بازاروں میں انواع واقسام کی لا تعداد اشیاء دستیاب ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا کی خریداری کیلئے چلے جاؤ تو ہر چیز بے شمار اقسام کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً شہد خریدنا مقصود ہو تو چھوٹی مکھی کا بھی ہے اور بڑی مکھی کا بھی عام پھولوں کا بھی ہے اور جنگلی جڑی بوٹیوں کا بھی۔ ہلکے سنہری رنگ کا بھی موجود ہے، قدرے بھورے رنگ کا بھی اور گہرے نسواری رنگ کا بھی۔ ایشیا سے درآمد شدہ بھی، یورپ کی سوغات بھی اور مقامی پیداوار بھی۔ ڈبل روٹی لینی ہو تو میدے کی بھی دستیاب ہے اور سوفی فیصد گندم کی بھی۔ چوکر کی بھی موجود ہے اور مختلف اجناس کی بھی۔ میدے کے ساتھ بھی ہے او بالکل سادہ بھی اس میں مختلف بیجوں اور تلوں کی آمیزش بھی ہے زیتون کے تیل کے ساتھ بھی ہے اور دودھ کے ساتھ بھی۔ غرضیکہ کوئی سامان خریدنا ہو یا مشروبات و ماکولات کی خریداری مطلوب ہو، معاملہ بعینہ یہی ہے۔ آنکھیں دیکھ دیکھ کر تھک جاتی ہیں، ذہن تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے اور انتخاب بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ خداوند یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔

دکانوں کی آرائش پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ دکانوں میں مامور عملے کے افراد بہت خوش مزاج اور تعاون کرنے والے ہیں۔ گاہک کے سوالوں کے تسلی بخش جواب دے کران کو مطمئن کرتے ہیں۔ اس صورتحال کی وجہ سے گاہک خوشی خوشی جیب ہلکی کر کے بلاضرورت سامان بھی خرید لیتے ہیں۔ پھر یہ سہولت بھی موجود ہے کہ خریدنے کے بعد اگر گاہک وہ سامان واپس کرنا چاہے تو مقررہ کردہ مدت کے دوران اسے دکان پر لوٹا کر اپنے پیسے واپس لے سکتا ہے۔

سب سے خوش کن نظارہ دکانوں پر سجی ہوئی بے شمار قسم کی سبزیوں اور پھلوں کو دیکھنا ہے ایسے تر و تازہ، خوشنما اور رنگین کہ بس دیکھتے ہی چلے جاؤ۔ ایسے ایسے پھل اور سبزیاں کہ جن کی لذت سے زبان نا آشنا ہے کہ جن کو کبھی آنکھوں نے دیکھا ہی نہ تھا۔ ایسی خوبصورت اور خوش رنگ کہ نقلی اور مصنوعی ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

دن کے وقت بستیوں میں ہو کا عالم ہوتا ہے۔ کیونکہ بچے اسکول چلے جاتے ہیں اور والدین اپنے اپنے دفتروں میں کام کرنے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو مائیں ڈے کیئر سنٹرز میں چھوڑ کر نوکری کرنے چلی جاتی ہیں۔ سب گھر مکینوں سے خالی ہو جاتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں سب کی واپسی ہوتی ہے اور اگلے دن صبح پھر وہی روٹین۔ چھٹی والے دن بھی لوگ دکانوں میں خریداری کیلئے یا سیر و سیاحت یا پکنک منانے چل دیتے ہیں۔ ہمسائیوں کو آپس میں ایک دوسرے کی کوئی خبر نہیں نہ ایک دوسرے سے سروکار ہے۔ اگر کبھی آمنا سامنا ہو جائے تو مسکراہٹوں کے تبادلے کو کافی وشافی سمجھا جاتا ہے۔

یہاں ایک مراعات یافتہ طبقہ مقامی کتے ہیں جو بے شمار اقسام کے ہیں۔ کچھ کے حلیے بھیڑ سے ملتے جلتے ہیں تو کچھ کے بھیڑیئے سے بعضوں کی جسامت ہمارے ہاں کے عام بکرے جتنی ہے تو بعض خرگوش سے ذرا چھوٹے ہیں، جنہیں خواتین اپنے پرس میں ڈال کر اٹھائے پھرتی ہیں۔ کتوں کے ایسے نازنخرے اٹھائے جاتے ہیں جیسے غالباً پرانے زمانے میں بادشاہوں کے اٹھائے جاتے ہوں گے رات کو لوگ اپنے اپنے کتے کی زنجیر تھامے انہیں ہواخوری کیلئے باہر لے جاتے ہیں۔ اگر بوڑھے یا بیمار لوگ اپنے کتوں کو سیر کروانے کیلئے نہ لے جاسکیں تو

پھر اس کے لئے کسی مددگار کو معاوضے پر بلایا جاتا ہے۔ یہ مددگار ڈاگ واکرز کہلاتے ہیں اور ایک وقت میں چار چار گھروں سے کتے اکٹھے کر کے ان کی زنجیریں تھامے انہیں گھما پھرا کر واپس پہنچا دیتے ہیں۔ راہگیر ان خوش قسمت کتوں کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہیں اور موقع ملے تو تھپتھپاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ کتا شاید ان کی زندگی کا اہم جز اس لئے ہے کہ یہ غیر مشروط طور پر ان کی تنہائیوں کا ساتھی ہے اور ان کے انسانی تعلقات کا نعم البدل ہے۔ کیونکہ یہاں میاں بیوی کی رفاقت کا کوئی بھروسہ نہیں کہ نہ جانے کب دونوں کی راہیں جدا ہو جائیں۔ اولاد کا بھروسہ نہیں کہ کب وہ والدین کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر دور دراز کی انجانی منزلوں کی طرف چل دے۔ بہن بھائی کا رشتہ تو خیر یہاں ہے ہی رسمی اور سطحی سا۔ لے دے کے صرف کتا ہی رہ جاتا ہے کہ جس پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کیا جائے کہ وہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ وہی توجہ کا محور ہے اور وہی محبت کا مرکز۔

ایک دن شام کو میں اپنے نواسے کو لے کر نزدیکی پارک میں چلی گئی۔ وہاں ایک چالیس پینتالیس سالہ خاتون اپنے ننھے منے سے کتے کے ہمراہ چہل قدمی کر رہی تھی۔ کتے کا پورا جسم قدرے لمبے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا یہاں تک کہ اسکے چہرے کو بھی بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی جسامت کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کر کے میرے نواسے نے مجھ سے پوچھا۔

''نانو! کیا وہ بلی ہے؟''

میں نے کہا

''نہیں! یہ کتا ہے۔ کتے کی اس نسل کو پُوڈل کہتے ہیں۔''

ہم دونوں کو دیکھ کر اس خاتون کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ہم دونوں اس کے کتے کو شوق اور محبت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی اور فورِ جذبات سے کہنے لگی۔

you know she is charming, she is cute, she is intelligent and she is well behaved

میں نے لمحہ بھر کیلئے سوچا کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہی ہے۔ چونکہ مذکورہ بالا صفات کی حامل میں نہیں ہو سکتی اسلئے یہ میرا ذکر خیر نہیں۔ پھر میں نے غور سے اس خاتون کی طرف دیکھا ان صفات کی جھلک موصوفہ کی شخصیت سے بھی نہیں چھلک رہی تھی تو پھر بھلا وہ کس کے متعلق کہہ رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھا۔

"But Who is she?"

اس نے اپنے کتے پر پیار بھری نظریں نچھاور کرتے ہوئے کہا

"she"

میں نے بے اختیار کہا

"but she is a dog"

اسے میرا غیر انسانی جواب پسند نہ آیا۔ اس نے فرطِ محبت سے کتے کو اٹھا کر اپنے سینے سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"she is not only a dog, she is my family"

چند لمحوں کیلئے ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئی ہو؟ میں نے بتایا کہ پاکستان سے۔ میں نے سوچا کہ بس یہ سنہری موقع ہے کہ اس عفیفہ کو بتایا جائے کہ میرے ملک میں زندگی انسانوں کے ساتھ مل جل کر کیسے بسر کی جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ پاکستان میں ہم ہمسائے آپس میں خوب میل جول رکھتے ہیں۔ اگر کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کرتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اسے پرہیزی کھانا بنا کر بھیجتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ الوسع ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

وہ میری باتیں غور سے سنتی رہی۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم لوگ یہ سارے کام بغیر کسی معاوضے کے کرتے ہو؟ اس کی حیرت کا عالم دیکھ کر میں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو گئی اور میں نے فخر سے کہا۔

of course!yes

اس نے حقارت سے کہا! How Foolish

اس بات کے ساتھ ہی ہماری مجلس برخاست ہو گئی اور ہم دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے ☆

فرحت طاہر

تمہارے شہر کا موسم

کراچی کے مرطوب موسم سے چل کر پنجاب تک پہنچنے کا قصہ، جہاں سردی ضرور تھی مگر اپنائیت کی گرمی کے ساتھ!

تمہارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے
میں ایک شام چرالوں اگر برا نہ لگے

شاعر کا نام تو یاد نہ آیا مگر شعر بڑا برونت ذہن میں آ گیا۔ اس وقت ہم دامن کوہ اسلام آباد میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کیا خوبصورت منظر تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور آسمان سے برستا پانی! اللہ کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ہی دل میں خیال آیا چلو اچھا ہے اللہ میاں نے اس ہریالی کو سیراب کرنے کا کام فرشتوں کو ہی سونپا ورنہ انسان تو ''تو رانی میں رانی، کون بھرے پانی'' کے مصداق ایک سے دوسرے پر ٹال جاتے! اپنے لاڈلے انسان کے لیے کیا زبردست انتظام کیا ہے! شاید یہ ہی سوچ کر بندروں کی ٹولی انسانوں کو بڑی کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی اور جہاں موقع ملتا حملہ کر دیتی کہ حضرت انسان نے ان کی جگہ پر بھی ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ اس حوالے سے ابونثر کا کالم یاد آیا جس میں انہوں نے سراسر انسانوں کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا کہ انہوں نے بندروں کو جنک فوڈ کا عادی بنا دیا ہے۔ ہماری چائے پر بھی حملے کی کوشش کی مگر ہم نے بیگ مارنے کا اشارہ کیا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس پر بچوں نے ہمیں بہت داد دی کہ خالہ نے ہمارا بدلہ لے لیا۔ پتہ چلا کہ جب ہم نماز پڑھنے گئے تھے تو بندروں نے ان کی چائے گرادی تھی۔

مغرب قریب تھی لہٰذا ہم سب واپسی کے لیے نیچے اتر آئے۔ ایک پر لطف اور پر مشقت دن کا اختتام ہوا مگر ابھی طویل مسافت طے کر کے ایک دعوت میں شرکت کرنی ہے۔

ذرا ٹھہریں! ہم آپ کو آغاز سفر سے بتاتے ہیں! چار دن پہلے ہم کراچی سے پنڈی پہنچے تھے۔ اس سال ماہ مارچ میں کراچی سے باہر سیر و سیاحت کا پروگرام بنا۔ اس کی آفر اور طلب تو برسوں سے تھی، ہاں جب حالات، چھٹی اور اخراجات سمیت دیگر عوامل طے ہوئے تو پروگرام فائنل ہو گیا۔ ہم تو اب بھی ٹال جاتے مگر ہماری بہن کے خاندان خصوصاً بچوں کے اصرار کے آگے ہماری ایک نہ چلی اور یوں رخت سفر باندھنا پڑا۔

جانے سے پہلے موسم نے بڑی ہیبت طاری کی ہوئی تھی۔ جہاں ہمیں جانا تھا، اطلاع کے مطابق وہاں چھتیس گھنٹے سے مسلسل بارش ہو رہی تھی! ظاہر ہے سفر کے خدشات میں موسم کی شدت کا عنصر بھی شامل ہے۔ ان تمام مرحلوں سے گزر کر وقت روانگی آ پہنچا اور اسٹیشن جانے والی گاڑی آ گئی۔ بیگز اور سوٹ کیسوں کی تعداد ہر فرد بار بار گننے میں لگ گیا جو ہر دفعہ مختلف آتی! وجہ؟ کبھی کندھے کا بیگ گنا جاتا اور کبھی نہیں، ظاہر ہے فرق تو آنا تھا۔ خیر اس مرحلے سے بھی گزر کر ہماری گاڑی روانہ ہوئی۔ ٹریفک جام بڑی بے چینی کا سبب بنتا کہ کہیں ہماری ٹرین نہ چھوٹ جائے مگر ایسا نہ ہوا۔ ہم اسٹیشن وقت سے بہت پہلے پہنچ گئے۔ خوشی کی بات کہ ٹرین وقت پر روانہ ہوئی۔ الحمد للہ سفر کی ابتدا بہت اچھی ہوئی۔ دعا اور امید تھی کہ اختتام بھی بخیر ہو!

ٹرین کے چلتے ہی نماز عصر ادا کی۔ قصر پڑھنے کا موقع مل رہا ہے لہذا اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ ٹرین شہری آبادی سے نکلی تو خوبصورت مناظر دل و دماغ کو بشاشت دینے لگے۔ اے سی کوپے کی وجہ سے صرف ایک طرف کا نظارہ ممکن ہوتا ہے چنانچہ کھڑکی کے پاس بیٹھنے کے لیے کشمکش رہی مگر تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا چھانے کے باعث اس منظر میں کوئی کشش نہیں رہی لہذا سب دیگر مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

بچوں کے لیے اوپر چڑھنے اور اترنے کی سرگرمی بھی وجہ ڈانٹ

ڈ پٹ بنتی رہی۔ اب بیچارے اتنی سی جگہ میں کیا کرتے؟ دنیا چھوٹی سی جگہ پر سمٹ آئی تھی تو زندگی کی حقیقت آشکارا ہورہی تھی کہ ہم نے خواہ مخواہ لوازمات زندگی اتنے بڑھا دیے ہیں۔ ویسے ضروریات زندگی تمام موجود تھیں۔کھانا وافر، ماحول میں خوشگوار ٹھنڈک ،آرام کے لیے بستر، پڑھنے کے لیے کتب، رابطوں کے لیے موبائل۔۔۔۔۔اورتو اور یوسف نے پانی کی لٹر بوتل کوالٹا کر ہولڈر میں لٹکا یا ہوا تھا جوڈسپنسر کا کام دے رہا تھا۔عشاء کے وقت کھانا کھا کر سونے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ڈائننگ کار سے بار بار مختلف چیزوں کی آفر آتی رہی مگر ماشاءاللہ ہم ہر چیز میں خود کفیل تھے۔ الحمد للہ سفر بہت اچھا رہا۔ٹرین کا انتظام بہت بہتر ہوگیا ہے۔ وقت کی پابندی ،محفوظ اور آرام دہ! واقعی کسی بھی شعبے کو اچھا سر براہ مل جائے تو اس کی قسمت بدل جاتی ہے ورنہ یہ ہی ٹرینیں تھیں جن کوردی میں بیچنے کا مشورہ بلور صاحب دے چکے تھے۔

صبح آنکھ کھلی تو ہماری ٹرین پنجاب میں داخل ہوچکی تھی۔ سرسبز کھیت اور باغات اللہ کی حمد وثنا پر اکسار ہے تھے۔آموں اور دیگر پھلوں سے لدے باغات اشتہا بڑھا رہے تھے، اگر چہ اس منظر میں خوشبو اور آوازوں کی کمی بوجہ ونڈوگلاسز محسوس ہورہی تھی۔ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی، بڑے اسٹیشن پر زیادہ دیر کے لیے رکتی جبکہ چھوٹے چھوٹے آکر گزرتے رہے۔ ملتان کے اسٹیشن پر نیشنل بک فاؤنڈیشن کے اسٹال سے پاکستان ریلوے کا شائع شدہ میگزین خریدا تو ایک نئی سرگرمی ہاتھ آگئی۔ اسکا لفظ لفظ پڑھا گیا اور اس میں موجود ٹرینوں کے شیڈول اوراسٹیشنوں کے نام پر بحث کہ اب کون سا آئے گا! یہاں اپنے قارئین کی دلچسپی کے لیے عرض کریں کہ پاکستان ریلوے اورنیشنل بک فاؤنڈیشن کے باہم اشتراک سے تمام بڑے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم پر کتابوں کے سٹال لگائے گئے ہیں، گویا کتب بینی کے فروغ کے لیے کافی کام ہورہا ہے جو قابل ستائش ہے۔

اب لاہور سے پنڈی کی طرف سفر شروع ہوگیا ہے۔اور شہری علاقے سے گزر کرصنعتی علاقے نظروں کے سامنے تھے۔گوجرانوالہ سے گجرات کی طرف جاتے ہوئے نہ صرف موسم تبدیل ہوگیا بلکہ کچھ اندھیرا بھی چھانے لگا۔لالہ موسیٰ اور کھاریاں کے بعد تو سردی کے بڑھنے کے احساس پر سب نے اوپر کی طرف رکھے گرم کپڑے نکال لیے۔کراچی والوں کے لیے تو خاصی تبدیلی تھی! یوں تو سارے پنجاب میں بارش کے آثار نظر آئے مگر اب با قاعدہ گرج چمک کے ساتھ شیشوں پر بارش کے اثرات نمایاں ہورہے تھے۔ ساتھ ہی ٹرین کی رفتار بھی سست ہو چلی تھی۔یوں تو باہر اندھیرا تھا مگر ہچکولے کھانے سے اندازہ ہورہا تھا کہ ہم پوٹھوہاری علاقے سے گزررہے ہیں۔کئی دفعہ سرنگوں سے گزرے جس کا احساس ٹرین کی آواز بدلنے سے ہوا۔مغرب کی نماز جمع بین الصلاتین کے تحت راولپنڈی پہنچ کر عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھنے کا سوچا۔

ہمیں ٹرین میں مقید ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے اور بے چینی سے منزل پر پہنچنے کے متمنی تھے۔ دوسری طرف جہاں پہنچنا تھا وہاں سے بھی کب؟ کہاں؟ کتنا؟ استفسار شروع ہوگیا تھا یعنی سراپا انتظار! دوسرے موسم پر ذراتشویش کا اظہار! جہلم کے بعد چکلالہ کا بورڈ نظر آیا تو ہم نے سامان سمیٹنا شروع کردیا۔1548 کلومیٹر کا فاصلہ تقریباً ستائیس گھنٹے میں طے کر کے آٹھ بجے ہم پنڈی پہنچ گئے ۔گاڑی کا انتظام پہلے ہی ہو چکا تھا! یہ سب موبائل فون کی کرامت ہے کہ ہم راستے بھر اس کے ذریعے نہ صرف سب لوگوں سے رابطے میں رہے بلکہ ضروری کام بھی نبٹاتے رہے۔ٹرین رکی توسب بہت اطمینان سے اترے ۔آخری اسٹیشن جو تھا! جلدی کا کوئی ایشو نہ تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے تھے جب ہم پنڈی اسٹیشن پر اترے ۔ خوشگوار ٹھنڈک کا احساس ہوا۔تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہم اپنی رہائش گاہ پر موجود تھے۔ یہاں میزبان دسترخوان سجائے بیٹھی تھیں۔حالانکہ ہم ٹرین میں سب کچھ تناول کر چکے تھے مگر اتنے اہتمام کو رد کرنا ناشکری ہوتا! میز بانی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور سیر کا پروگرام بناتے رہے ۔ہم سب کو رہائش اور موسم کے لحاظ سے ضروری بریفنگ دی گئی۔اس دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ دس بجے لائٹ چلی جائے گی ایک گھنٹے کے لیے! جی ہاں! لوڈشیڈنگ یہاں بھی ہوتی ہے۔ہم سب باتوں میں ایسے

منہمک تھے کہ بجلی آ بھی گئی یعنی پورا گھنٹہ گزر گیا دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے!! باتیں، باتیں اور صرف باتیں! گزری باتیں اور آنے والے دنوں کے پروگرام!! ہر کمرے میں آتش دان یہاں کے موسم کی ضرورت ہیں! بستر پر گرتے ہی نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔ موسم کے حوالے سے ہمیں خصوصی تاکید کی گئی کہ اسے ہرگز ہلکا نہ لیا جائے۔ صبح سو کر اٹھے تو ہمارے اوپر مزید ایک کمبل ڈلا ہوا تھا۔ ہم نے مسکرا کر اپنی میزبان کو دیکھا اور مشتاق احمد یوسفی کو یاد کیا جن کے مطابق کراچی اور پنڈی میں دو لحافوں کا فرق ہے! بعد میں معلوم ہوا اس دن مہینے کا کم ترین درجہ حرارت تھا۔

نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر سونے کا ارادہ کیا کہ۔۔ابھی بستر کی طرف بڑھے ہی تھے کہ گیٹ پر کسی کی آمد کی بیل بج اٹھی۔ اور ہم سب کے کان لپیٹ کر پڑنے کے باوجود مسلسل بجتا رہا۔ کوئی ڈھٹائی سی ڈھٹائی ہے! معلوم ہوا ہماری میزبان نے اپنے مہمانوں کی تواضع کے لیے اپنے جاننے والوں سے گدے اور کمبل ادھار مانگے تھے (یہ یہاں کا کلچر ہے مہمان کی آمد پر سب ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں) لہذا ان کا ڈرائیور معذرت کے ساتھ کہ رات بارش تیز تھی نہ پہنچ سکا۔ اس نے جلدی جلدی اپنا بوجھ ہلکا کر کے گاڑی دوڑا دی اور ہم ایک ٹک اس ڈھیر کو دیکھ رہے تھے جو ایک پہاڑ کی شکل میں کمرے میں رکھا گیا۔ مگر یہ سب تو بہت زیادہ ہے! ہمارا احتجاج صدا بہ صحرا ثابت ہوا اور یہ سارا ڈھیر کمرے کے کنارے سج گیا۔ اہتمام تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ نہ جانے کب ضرورت پڑ جائے!

جب سب اٹھے تو پر تکلف ناشتہ خوش گپیوں میں کھایا گیا۔ اس دوران یادوں کی پٹاری کھلی اور کھلتی ہی چلی گئی۔ عزیزہ لبنیٰ کا فون آنے لگا! وہ منتظر بیٹھی تھیں ہماری میزبانی کے لیے! ان سے یہ ہی کہا کہ ہماری آمد کی خوشی میں یہاں بچوں تک نے چھٹی کی ہے لہذا ہم آج کا دن یہیں آرام کر کے کل سے تفریح اور ملاقاتیں کریں گے ان شاء اللہ! آج کی چمکدار، خوبصورت دھوپ دیکھ کر یقین نہیں آ رہا کہ یہ وہی جگہ ہے۔ اگلے دن صبح سویرے گاڑی مع ڈرائیور آ پہنچی۔ میزبان کا مشورہ تھا کہ نیٹ کے ذریعے سرچ کر کے تفریحی جگہیں منتخب کی جائیں تاکہ بوریت اور تھکاوٹ سے بچا جا سکے اور اس پر سب متفق تھے مگر ہوا یہ کہ بغیر اس ہوم ورک کے گاڑی میں جا بیٹھے اور اس کا بھی جواز تھا کہ ضروری نہیں کہ جو چیز اسکرین میں اچھی لگ رہی ہو واقعی پر لطف بھی ہو۔ اپنی قسمت اور اپنا تجربہ! ڈرائیور کو چند جگہیں بتا دیں کہ وہ اس لحاظ سے روٹ بنا لے۔ بھروسہ تو اس پر کرنا ہی تھا نا!

سب سے پہلے راول ڈیم پارک کا رخ کیا۔ برڈز پارک میں چہچہاتے ہوئے پرندے گویا اللہ کی کبریائی بیان کر رہے تھے۔ خود بخود زبان سے سبحان اللہ نکل رہا تھا۔ وہاں سے ہوتے ہوتے ڈیم کی طرف نکل گئے۔ نوجوانوں اور خواتین کی ٹولیاں بوٹنگ کر رہی تھیں۔ ہم میں سے اکثریت پانی کی تفریح سے خوفزدہ تھی، خود ہماری آنکھوں میں اخبارات کی خبر گھوم رہی تھی کہ راول ڈیم میں کشتی ڈوبنے سے لوگ ڈوب گئے۔۔۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ زندگی کا رسک تو ہر جگہ یکساں ہے اور پھر کالجوں کے گروپ کے گروپ کو کشتی رانی کرتے دیکھ کر ہم نے بھی ہمت پکڑی اور اللہ کا نام لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ بھی ایسا نہ ہوا کہ خبر بن سکے اور ہم الحمدللہ پڑھتے ہوئے کشتی سے اتر آئے۔ ہمارے سفر کے دوران ہی بادل گھر آئے اور موسم کا رنگ بدلنے لگا۔ ویسے بارش کی تو پیشن گوئی ہے ہی! قرآن کی بہت سی آیات یاد آئیں جو کشتی کے سفر کے دوران انسانی احساسات کے حوالے سے ہیں!

کون آئسکریم اور سنیکس لے کر ہم چیڑ اور پائن کے باغ میں لکڑی کی بنچوں پر بیٹھ گئے۔ گلہریاں اور نیولے آزادانہ گھوم رہے تھے اور ہمیں خوب گھور رہے تھے۔ ظاہر ہے ہم ہی اجنبی تھے یہاں! وہ تو نسلوں سے یہیں آباد ہیں۔ ویسے یہاں قدرتی ماحول بھرپور طریقے سے محفوظ کیا گیا ہے۔ باڑھیں اور گرل میں بھی درختوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ بچوں نے چلغوزے کے کونز جمع کیے۔

اب ہم پارک کے بیرونی حصے کی طرف آئے جہاں جوق در جوق لوگ آ رہے تھے۔ خواتین اور لڑکیوں کے زرق برق ملبوسات دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اکثریت شادی کی تقریب گزار کر پکنک کو نکلی ہوئی ہے۔ یہاں گھڑسواری کا انتظام تھا۔ اب ہم اگلی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ چائنیز پارک،

جاسمین پارک، روز پارک! یہ سب ہم نے سرسری طور پر دیکھا کیونکہ ایک پارک کی بھرپور تفریح ہم کر ہی چکے تھے اب ہم ذرا مختلف جگہ دیکھنا چاہتے تھے مثلاً میوزیم وغیرہ لہٰذا شکرپڑیاں پر واقع لوک ورثہ میں جا اترے۔

یہاں داخل ہوئے تو جگہ جگہ ثقافتی اسٹالز لگے تھے۔ ہم سب ٹکٹ لے کر واک تھرو سے گزر کر اندر داخل ہونے لگے تو ہماری بہن کے پرس میں موجود چھری اور قینچی بج اٹھے۔ خاتون نگران نے وہ اپنی دراز میں رکھ لیے۔ یہاں کی دنیا میں ہم سب مسحور ہوگئے تھے۔ ایک کے بعد ایک در کھلتے جاتے اور ہم اس میں داخل ہوکر گم سے ہوجاتے۔ ہندوستان ، ایران،افغانستان سے لے کر وسط ایشیا کی ریاستیں ۔۔۔۔۔خطے کی تمام اقوام اور مذاہب کے رہن سہن، رسوم ورواج اور اہم باتوں کو ماڈلز کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔ایک طرف مذہبی ، روحانی اور تصوف کے سلسلوں کی منظر کشی تھی تو دوسری طرف رومانوی داستانوں کو بھی نمایاں کیا گیا تھا۔ کئی گھنٹے گزار کر باہر نکلے مگر اس سے پہلے کاؤنٹر سے اپنی چھری اور قینچی لینا نہ بھولے اور تاثرات کا رجسٹر منتظمہ کی دراز سے نکلوا کر اپنے خوشگوار احساسات رقم کیے۔ گھنٹوں بعد باہر نکل کر بیرونی دنیا سے رابطہ ہوا تو مانوس ہونے میں تھوڑا وقت لگا گویا ٹائم مشین میں بیٹھ کر صدیوں کا سفر کر آئے ہوں!

اب ہمارا رخ یادگار پاکستان یعنی پاکستان مونومنٹ کی طرف تھا۔شکرپڑیاں میں واقع اس خوبصورت اور پرشکوہ قومی یادگار کا مقصد دنیا کے سامنے پاکستانی تہذیب وثقافت اور قیام پاکستان کی جدو جہد کو متعارف کروانا ہے۔ ایک قابل فخر جگہ! اس کی دیواروں پر ان تمام افراد کے ہاتھوں کے نقوش بنے ہیں جنھوں نے اس کو بنانے میں حصہ لیا! اس یادگار کے بالکل سامنے مونومنٹ میوزیم بھی بنایا گیا ہے۔ اس کے الگ سے ٹکٹ لیے گئے۔ داخل ہوتے ہی تحریک آزادی کے مناظر دیکھ کر بچوں سمیت ہم سب نے تحریک پاکستان کے سبق کی یاد دہانی کی۔ یہاں ماڈلز کے علاوہ آڈیٹوریم میں ڈاکومنٹری دکھانے کا بھی انتظام ہے۔

یہاں سے باہر نکلے تو بوندا باندی شروع ہوچکی تھی اور ہم بہت تھک چکے تھے مگر ہنوز سفر باقی تھا۔ اب ہم فیصل مسجد کی طرف رواں دواں تھے۔ وہاں پہنچے تو بارش تیز ہوچکی تھی۔ جب تک ہم اوپر پہنچے نماز عصر ختم ہوچکی تھی۔ یہاں ہمارا پاؤں پھسلا تو بچوں کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہاں سے نکل کر ہم دامن کوہ پہنچے جس کا ذکر ہم آغاز میں کر چکے ہیں۔ آپ پڑھ کر ہی تھک رہے ہیں ذرا ہمارا سوچیں کیا حال ہوگا؟ لیکن مجبوری یہ کہ جگہیں زیادہ اور وقت کم اور پھر ہم ایک تفریحی دورے پر ہی آئے ہیں۔ ذہنی تھکن دور کرنے کے لیے جسمانی تھکاوٹ لازمی ہے۔ اب تو بس آرام کا دل تھا مگر ابھی ہمیں عزیز دوست کے گھر کھانے پر پہنچنا تھا اور اس سے پہلے گھر ڈھونڈنے کی مہم تھی کیونکہ بقول ڈرائیور یہ جگہ اس کے لیے نئی ہے۔ پرتکلف کھانا اور بے تکلف محفل! ساری تھکاوٹ بھول گئے۔

اگلے دن مری ایوبیہ کی برف باری سے لطف اٹھایا۔ حالانکہ برف باری کا موسم گزر چکا تھا۔ اس بے موسم کی برف باری پر شکر ادا کیا کہ رب نے ہمیں اس منظر سے بھی محروم نہ رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ راستے خطرناک ہونے کی وجہ سے ہم سب نڈھال سے ہوگئے تھے۔ کراچی کے رہائشی منفی آٹھ درجہ حرارت میں اتنا وقت گزارنے کے باوجود درست حالت میں پائے گئے! خبر تو بن سکتی ہے نا! جاگرز، سوئٹرز، جیکٹ، دستانے،۔۔۔۔۔چھتری وغیرہ بیگ میں رکھتے ہوئے ہم کتنا الجھ رہے تھے پسینہ پسینہ ہوکر اور اب ان کی افادیت معلوم ہو رہی تھی!

بہت سے تفریحی مقامات دیکھنے کے بعد ملاقاتوں کے پروگرام پر توجہ دی مگر ایک آدھ سے ہی ہوسکی باقی لوگوں سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا کچھ لوگ شہر سے باہر تھے اور جس دن شہر میں تھے ہم تفریحی دورے پر صوبہ خیبر گئے ہوئے تھے لہٰذا ملاقات ممکن نہ ہوسکی۔ ہاں عابدہ فرحین کے گھر گئے جو ہماری رہائش سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھیں۔ کراچی کی ساتھی کو ایک دوسرے شہر میں دیکھنا ایک عجیب خوشی کا باعث تھا۔

ہفتہ وار چھٹیوں میں ہمارے میزبان نے زبردست تفریحی دورے کا انتظام کیا تھا۔ پہلے تو ہم ٹیکسلا میوزیم اور اس سے ملحقہ پارک گئے۔ میوزیم میں فوٹوگرافی ممنوع تھی مگر ایک تصویر بنانے کی اجازت مل گئی۔ٹوٹی پھوٹی اشیاء شیشوں میں سجی دیکھ کر ایک تبصرہ سننے کو ملا کہ ردی والے سے خریدی گئی ہیں! ہم سب مسکرا اٹھے۔ اس کے بعد سرکپ کے تین ہزار

پرانے زمین سے دریافت شدہ شہر گئے۔ محکمہ آثار قدیمہ کے زیر انتظام شہر خموشاں کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جن گھروں میں ہم آرام سے چہل قدمی کر رہے تھے وہاں کے رہائشی بڑے کروفر سے رہا کرتے تھے آج ہمارے قدموں تلے تھے! زبردست ٹاؤن پلاننگ نظر آئی۔ اور جب گائیڈ نے بتایا کہ اسلام آباد کا شہر اسی نقشے کے مطابق بسایا گیا ہے تو ہم سوچ میں پڑ گئے۔ خیال تو ہمارے بھائی نے یہ بھی دلایا کہ کہیں بتوں اور مجسموں کو دیکھنے سے گناہ تو نہیں ملے گا؟ عبرت کی جائے دیکھ کر اپنی اوقات یاد آ جاتی ہے اور پھر **قل سیرو فی الارض** کی آیت بھی سامنے ہے!

یہاں سے نکل کر ہری پور ہوتے ہوئے خان پور ڈیم پہنچے۔ یہ ایک زبردست تفریحی مقام ہے۔ یہاں ہم نے بہت لطف اٹھایا۔ بے حد خوبصورت اور منظم، صاف ستھری جگہ ہے۔ پارک میں مختلف اقسام کے کچرے (شیشہ، لکڑی، پلاسٹک وغیرہ وغیرہ) کے لیے علیحدہ علیحدہ ڈبے نظر آئے۔ خاصی ماحول دوست جگہ ہے! یہاں بوٹنگ کے لیے چھ ماہ کے بچے سمیت ہم سب کو لائف جیکٹ پہنائی گئی۔ بلندی پر بنے گندھارا ہوٹل سے ڈوبتے سورج کا نظارہ بہت دلکش منظر تھا۔ شفاف پانی میں عکس یوں لگ رہا تھا جیسے رنگ گھول دیا گیا ہو! آسمان کا رنگ بھی اتنا نکھرا تھا کہ بیان سے باہر ہے!

اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے ہم نکل گئے۔ راستے میں یہاں کے مشہور مالٹے بھی خریدے جو مزے، خوشبو اور رنگ میں بڑے لاجواب تھے۔ خواتین نے آرائشی چیزیں خریدنے کی کوشش کی جو مرد حضرات کے عدم تعاون کے باعث جزوی کامیاب رہی۔ واپسی میں ہم لبنٰی کے گھر واقع ڈی ایچ اے اتر گئے۔ پہلے کی طرح تھکے ہوئے پہنچے۔ کھانا کھا کر گرم گرم بستر میں گھس گئے۔ بچیاں باتیں کرتے کرتے سو گئیں تو ہماری تھکی مندی آنکھیں دیکھ کر ہمیں بھی آرام کا مشورہ ملا۔ صبح اٹھے تو بارش کے ساتھ اولے بھی دیکھے۔ ہری ہری گھاس پر سفید نرم نرم اولے! بہت حسین منظر تھا۔ یہ جگہ بھی بہت زبردست ہے ماشاء اللہ! دن کے اجالے میں زیادہ اندازہ ہوا۔ پہاڑ کے دامن میں غیر آباد علاقہ میں بنا بنگلہ خاصہ آرٹسٹک ہے۔ ناشتے کے بعد دوپہر کے لیے تلن کی تیاریاں تھیں مگر ہمارے سفر کے ساتھی ہمارے بغیر اداس ہونے لگے تو ہم واپس کینٹ اپنی رہائش گاہ آ گئے۔

پنڈی سے ہمارے کوچ کا وقت آ پہنچا تھا مگر اس سے پہلے سیور فوڈ کھانا تھا، میٹرو میں سفر کرنا تھا، ایوب پارک دیکھنا تھا۔ سیور فوڈ کو بے مزہ جان کر ہماری میزبان نے اپنے ہاتھ سے تیار کردہ چٹ پٹے کھانے کھلائے۔ ایوب پارک کے بجائے مونال کا پروگرام بنا جو یہ کہہ کر رد ہو گیا کہ ہم وہاں جا چکے ہیں اب دوبارہ ہمت نہیں ہے ہاں میٹرو میں سفر ضرور کیا! صرف بیس روپے میں دوسرے شہر پہنچنا زبردست ہے۔ ہاں! جیب کتروں سے ہوشیار رہنے کے اعلانات سن سن کر دل بہت خراب ہوا۔ لگتا ہے اسلام آباد جیب کتروں کا شہر ہے! فیصل مسجد میں وہی تفریحی ماحول نظر آیا۔ یہاں آنے والے زائرین اور نمازیوں کے باعزت روزگار کی دعا ہے کہ وہ جیب کتری کا دھندہ چھوڑ سکیں! اب ہماری لاہور روانگی تھی۔ ایک دن کھاریاں جانے کا بھی پروگرام تھا کہ وہاں سے مستقل اصرار تھا مگر پنڈی سے ہی مہلت نہ ملی۔ دونوں گھروں میں بھرپور پذیرائی رہی۔ ہماری امی کہتی تھیں کہ دو گھروں کا مہمان بھوکا رہ جاتا ہے مگر ہمارے ساتھ بالکل ایسا نہ ہوا۔ ایک جگہ میز سجی چھوڑ کر جاتے دوسری جگہ دستر خوان پر لذیذ پکوان ملتے۔ سب سے بڑھ کر محبت! اللہ اس کو قائم رکھے اور برکت عطا کرے۔

بہر حال کھاریاں والے میزبان سے یہ طے ہوا کہ لالہ موسیٰ پر تھوڑی دیر کو ٹرین رکتی ہے وہاں ملاقات کر لی جائے گی۔ دو گھنٹے بعد صبح نو بجے دو منٹ کو ٹرین رکی۔ جس میں انواع و اقسام کے کھانے ہمارے ان مہربانوں نے ہمارے حوالے کیے جبکہ ہم نے بھی ایک تحائف کا ایک پلندہ ان کو پکڑایا۔ اس دو منٹ میں اتنی برکت ہو گئی کہ کئی سیلفیز بھی بنا لی گئیں۔ زبردست ایڈونچر تھا! ٹرین کے دیگر مسافر بھی نیند سے بیدار ہو گئے جنہیں ہم نے اس پرتکلف ناشتے میں شریک کر لیا۔ باقی کھانے کو ہم نے محفوظ کر لیا لاہور کے لیے مگر پھر بھی ہماری ضرورت سے بہت زائد تھا لہٰذا اسے کہیں بھجوا کر ذائقے کی داد وصول کی یہ الگ کہانی ہے!

(جاری ہے)

☆......☆......☆

حمیرا خالد

زندگی کے چار نظریے

جو اس دنیا میں انسان کی حیثیت اور کارگزاری کو متعین کرتے ہیں، اور دنیا میں موجود مختلف دساتیر حیات میں کارفرما ہیں

انسان کو اس دنیا میں کیسے کام کرنا چاہئے اور اسکا برتاؤ کیا ہونا چاہئے یہ ایسا سوال ہے جس کا تعلق اس بات سے ہے کہ انسان کیا ہے، اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کو ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو دنیا میں انسان اور کائنات کے تعلق سے چار نظریے پائے جاتے ہیں۔ دنیا میں جتنے دستور زندگی موجود ہیں، انہوں نے انہی چار میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

(۱) خالص جاہلیت

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامہ سے وجود میں آیا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی حکمت کوئی مصلحت اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ یونہی بن گیا ہے یونہی چل رہا ہے، اور یونہی بے نتیجہ ختم ہوجائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے اگر ہے بھی تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔

انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرف سے اتفاقاً پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ خواہش رکھتا ہے، جن کو پورا کرنے کے لئے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے، کچھ قویٰ رکھتا ہے جن سے اپنی خواہشوں کی تکمیل کرسکتا ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہی حیوانی مطالبات و خواہشات کو پورا کرے۔ ان کو پانے کے لئے بہتر سے بہتر ذرائع حاصل کرے۔

اپنی اس زندگی کے قانون کے لئے اس کے پاس کوئی ہدایت کا سرچشمہ تو ہے نہیں۔ اپنے گردوپیش کے احوال اور تاریخ کے تجربات سے وہ خود ہی اپنے لئے قانونِ عمل اخذ کرے۔ علاوہ ازیں اگر یہ جوابدہ ہے تو اپنے ہی سامنے یا پھر اس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی نے پیدا کیا ہے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں وہ بھی اس دنیوی زندگی کی حد تک ہیں کیونکہ اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر ہونے کا فیصلہ بھی انہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اس کی بنیاد پر ایک خالص مادہ پرستانہ نظام اخلاق بنتا ہے۔ پھر اسی ذہنیت سے علم وفنون بنتے ہیں بلکہ پورے نظام تعلیم وتربیت میں الحاد اور مادیت کی روح سرائیت کر جاتی ہے۔

جب انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں تو اس طرز کی سوسائٹی میں وہ لوگ ابھرتے ہیں جو سب سے زیادہ مکار، بددیانت، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہوتے ہیں۔ تمام سوسائٹی کی قیادت اور مملکت کی زمام کار انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ شتر بے مہار کی طرح ہر حساب سے بےخوف اور ہر احتساب سے بے پروا ہو کر خلقِ خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں، جہاں کوئی مادی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے روک نہیں سکتی۔ یہ ظلم مملکت کے دائرے میں اس انداز سے ہوتا ہے کہ طاقت ور طبقے اپنی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں۔ اور مملکت کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی اور امپریلزم کی صورت میں ہوتا ہے۔

(۲) مشرکانہ جاہلیت

یہ دوسرا نظریہ شرک کے اصول پر ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں اور نہ بے خدا ہے، مگر اس کا خدا ایک نہیں بلکہ بہت سے خدا ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت سے نہیں ہے اس لیے اس خیال آرائی پر مشرکین کے درمیان کبھی اتفاق ہوا اور نہ ہوسکتا ہے۔

خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔فرشتے،جن،زندہ مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، آگ، چاند سورج، سب مشرکین کے معبودوں میں جگہ پاتے رہے۔خالص جاہلیت کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانہ سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے۔انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد کی خدائی کے قائل ہو گئے، وہاں خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہو گئی لیکن اب انبیاء،اولیاء،شہداء،علماء،مشائخ،ابدال کی جگہ کسی نہ کسی طرح اس عقیدہ میں بنتی رہی جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان نیک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگی بندوں کی خدائی ختم کرنے اور اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوتی تھیں۔ اب وہ سب معاملات جو اللہ اور بندوں کے درمیان ہوتے ہیں ان بزرگوں سے متعلق ہو گئے۔اب فاتحہ، زیارات، نذر نیاز، عرس، چڑھاوے، علم، تعزیے کی ایک نئی شریعت تصنیف کر ڈالی گئی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے تقرب کی کیفیات کی ایک پوری مائتھالوجی تیار ہو گئی۔

مشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا تعلق اپنے معبودوں کے ساتھ اس کے سوا نہیں کہ یہ ان کو صاحب اختیار اور نافع وضار سمجھ لیتا ہے اور مختلف مراسم عبودیت کے ذریعہ اپنے دنیوی مقاصد میں ان کی مہربانی واعانت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہاں سے انہیں کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا ضابطہ وقانون ملے تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں۔ کیونکہ وہاں کوئی فی الواقع خدا ہو تو ہدایت ملے۔ جب ایسی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے تو مشرک انسان خود اپنے لیے اخلاقی نظریہ گھڑتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر شریعت تصنیف دے لیتا ہے۔ اس طرح روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص امتیازات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ پھر شاہی خاندان اور مذہبی طبقے باہم ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں اور جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلط قائم کر لیا جاتا ہے۔

(۳) راہبانہ جاہلیت

یہ تیسرا نظریہ رہبانیت پر مبنی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لئے ایک دارالعذاب ہے۔انسان کے لئے اس دنیا میں خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو جسمانی تعلق کی وجہ سے ہیں دراصل اس قید خانہ کے طوق وسلاسل ہیں۔انسان اس دنیا میں ان چیزوں سے جتنا تعلق رکھے گا اتنا ہی گندگی سے آلودہ اور عذاب کا مستحق ہوگا۔نجات کی صورت یہ ہے کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے، خواہشات کو ہٹایا جائے، لذات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے، رشتہ داروں کی ساری محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے اور اپنے اس دشمن یعنی نفس وجسم کو مجاہدات وریاضات سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا زور قائم نہ رہ سکے۔اس طرح روح ہلکی اور پاک وصاف ہو جائے گی اور نجات کے بلند مقام حاصل کرنے کے قابل ہو جائے گی۔

یہ راہبانہ تصور جاہلیہ انسانی جماعت کے نیک اور پاکباز افراد کو دنیا کے کاروبار سے گوشہ عزلت میں لے جاتا ہے اور بدترین قسم کے شریر افراد کے لئے میدان صاف کر دیتا ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متولی بن کر آزادی کے ساتھ فساد پھیلانے میں اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کیے چلے جاتے ہیں۔

جب یہ راہبانہ فلسفہ واخلاق انسانی فطرت سے شکست کھا جاتا ہے تو کفارے کا عقیدہ ایجاد کیا جاتا ہے تا کہ دل کھول کر گناہ کیا جا سکے اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

یہی تصور جب انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں داخل ہوتا ہے تو خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ دنیا کو دارالعمل، دارالامتحان کی بجائے دارالعذاب کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کیا جائے۔یوں آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں یہاں کام کرنے اور دنیا کے معاملات چلانے نہیں آیا بلکہ گندگی ونجاست میں پھینکا گیا ہوں جس سے مجھے بچنا اور دور بھاگنا چاہئے۔میرے لیے صحیح یہ ہے کہ میں ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی بجائے ان سے کنارہ کروں۔وہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اس گناہ کی زندگی کا

کفارہ ہیں مجھے انہی کو پورے انہماک سے انجام دیتے رہنا چاہئے تا کہ آخرت میں نجات حاصل ہو۔

اس ذہنیت سے انبیاء کی امتوں میں سے ایک گروہ کو مراقبہ و مکاشفہ، چلہ کشی، ریاضت، وظائف کے چکر میں ڈال دیا اور مستحبات و نوافل میں وہ انہیں فرائض سے بھی زیادہ منہمک کر کے خلافت الہیہ کے اس کام سے غافل کر دیا جس کو جاری کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام آئے تھے۔

دوسرے گروہ میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ناپ تول اور غلوکرنے کی بیماری پیدا کردی کہ ان کے لئے خدا کا دین ایسا نازک آبگینہ ہوگیا جوذرا ذرا سی باتوں سے پاش پاش ہوجاتا ہو۔ دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد سے جوتنگ دلی، جمود اور کم حوصلگی پیدا ہوتی ہے وہ کہاں یہ قابلیت باقی رکھ سکتی ہے کہ انسانی زندگی کے بڑے مسائل پہ بھی نظر ڈالی جائے، دنیا کی امامت ورہنمائی کیلئے مستعد ہوا جائے۔

(۴) اسلام

یہ چوتھا نظریہ وہ ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گردوپیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا جز ہم خود ہیں، دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے۔ اسی نے اس کو بنایا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا سب کے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔

انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے۔ رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کے سوا کچھ اور ہونا س کے امکان میں ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس نظام حکومت میں انسان کی خودمختیاری اور غیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہیں یہ خود اپنے لئے طریق زندگی وضع کرنے او اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اس کی پیروی کرے۔ اس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

انسان کی آزمائش کیلئے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا اور اپنی سلطنت کا پورا اندرونی انتظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیر کرتا ہے۔ ظاہر میں انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہوا دیکھتا ہے اس کے اندر اپنے آپ کو موجود پاتا ہے اور ظاہر حواس سے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کا محکوم ہوں اور اسے کسی کو حساب دینا ہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو کوئی ایسی صریح علامت نہیں کہ وحی اترتی دکھائی دے۔

دوسری طرف آدمی ایک حد تک اپنے آپ کو بالکل خودمختار پاتا ہے بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دے دی گئی ذرائع بہم پہنچا دیئے گئے اور بڑی لمبی ڈھیل دے دی جاتی ہے...... مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو کوئی زبردستی نہیں پوری آزادی دی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں یعنی بغاوت اور بندگی غیر کی صورتوں میں رزق برابر ملتا رہتا ہے ۔سامان زندگی، اسباب عیش حسب حیثیت خوب دیئے جاتے ہیں، مرتے دم تک دیئے جاتے رہتے ہیں۔

یہ سارا طرز کارروائی اس لئے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل تمیز، استدلال، اختیار ارادہ کی جو قوتیں دی ہیں، اپنی بے شمار مخلوقات پر حاکمانہ تصرف کی جو قدرت بخشی ہے، اس میں وہ آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈالا گیا ہے تا کہ انسان کی عقل کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اس کی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اس سے منہ موڑ جاتا ہے۔

یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اس لئے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عمل نیک کا انعام نہیں بلکہ امتحان کا سامان ہے اور جو تکالیف مصائب پیش آتے ہیں وہ کسی عمل بد کی سزا نہیں بلکہ اس قانون طبعی کے تحت ہیں جس پر دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے یہ علم کہ آخرت میں کسی طریقہ، کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا برا ہوگا، صرف اس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئی ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتداء سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن

اسی تہذیب وتمدن کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے انبیاء پے در پے

بھیجے گئے۔

جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی، طبعاً اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کر لے، زمام کار اپنے ہاتھ میں لے اور زندگی کا نقشہ اپنے طرز پر بنائے، جس تہذیب کے ہاتھ میں زمام کار ہوتی ہے وہی علوم وفنون کی رہنمائی کرتی ہے، وہی اخلاق کے سانچے بناتی ہے، وہی تعلیم وتربیت کا انتظام کرتی ہے۔

اسی طرح اس تہذیب کے لئے زندگی میں کہیں کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ اگر ایک طویل عرصے تک کسی تہذیب کا دور دورہ رہے تو غیر حکمران تہذیب عمل کے میدان سے خارج از بحث ہوجاتی ہے یہاں تک کہ اس تہذیب سے ہمدردانہ نقطہ نظر رکھنے والے بھی اس شبہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ یہ طریقہ دنیا کی زندگی میں چل بھی سکتا ہے یا نہیں۔

پس دنیا میں انبیاء کے مشن کا مقصود یہ رہا ہے کہ حکومت الٰہیہ قائم کر کے اس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ اہل جاہلیت کو یہ حق دینے کو تو تیار تھے کہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں، اس حد کے اندر کہ ان کے عمل کا اثر انہی کی ذات تک محدود رہے، مگر وہ انہیں یہ حق دینے کے لئے تیار نہ تھے کہ اقتدار کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو طاقت کے زور سے جاہلیت کے نظریات پر چلاتے رہیں۔

اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی بعض کی مساعی تو صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں جیسے ابراہیم علیہ السلام، بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کی مگر حکومت الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی ان کا کام ختم ہوگیا جیسے حضرت مسیح علیہ السلام بعض نے اس تحریک کو منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

نبی کے کام کی نوعیت

(۱) تمام انبیاء کے کام کی نوعیت یہ پائی جاتی ہے عام انسانوں کے اندر فکری، ذہنی انقلاب برپا کرنا کہ ان کے سوچنے کا طریقہ، زندگی کا مقصد، قدر قیمت کا معیار اور عمل کا ڈھنگ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔

(۲) جو لوگ اس تعلیم وتربیت کو قبول کر لیں، ان کا ایک مضبوط جتھا بنا کر جاہلیت کے ہاتھوں سے اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا، اس جدوجہد میں تمام رائج الوقت اسباب سے کام لینا۔

(۳) اسلامی نظام حکومت قائم کر کے تمام شعبوں کو خالص اسلام کی اساس پر مرتب کر دینا، اور ایسی تدابیر اختیار کرنا کہ ایک طرف انقلاب کا دائرہ روئے زمین پر وسیع ہوتا جائے اور دوسری طرف اس میں شامل نئے افراد کی ذہنی واخلاقی تربیت کا بندوبست ہو۔

(ماخذ: تجدید واحیائے دین، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

☆......☆......☆

افشاں نوید

تمہاری وفا ہمارا اثاثہ

اندرا گاندھی کا خواب تھا کہ دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق ہوجائے، ہر پھانسی کیا یہ شہادت نہیں دے رہی کہ دوقومی نظریہ زندہ ہے!

دوبار ہی تفصیلی ملاقات ہوئی ہے ان سے۔ وہ میرے پڑوس میں مہینہ بھر سے اپنی بیٹی کے پاس مقیم ہیں۔ ہر دوتین برس بعد پاکستان کا چکر لگاتی ہیں مگر اب کے پانچ برس بعد آئی ہیں ڈھاکہ سے۔ بہت مزے دار اردو بولتی ہیں ایک خاص ردھم کے ساتھ حیرت مجھے اس پر ہوتی ہے کہ اسی برس کی دہائی گزار رہی ہیں مگر نہ ان کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ ہے نہ ہی سر پر کوئی بال سفید۔ ایک عجیب عاجزانہ سی مسکراہٹ رہتی ہے ہمیشہ چہرے پر۔ یادداشت ذرہ برابر متاثر نہیں ہے اس عمر میں بھی۔ سقوط ڈھاکہ کے غم یوں دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے روانی سے بیان کر رہی تھیں جیسے دیوار پر نصب اسکرین پر فلم چل رہی ہو۔! بہت میٹھے لہجے میں ''بابو'' کہہ کر ہر اک کو مخاطب کرتی ہیں۔ ہمیشہ کاٹن کی ہلکے رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے رہتی ہیں۔ میں نے کہا ''اماں جی یہاں تو بچیوں کے بال سفید ہو رہے ہیں اور نظر کے چشمے لگے ہوئے ہیں آپ راز بتایئے اپنی صحت کا۔؟''

بہت سادہ سی چھوٹے چھوٹے جملوں میں گفتگو کرتی ہیں بولیں۔ ''ایک تو مچھلی ہماری روزانہ خوراک کا حصہ ہے دوسرے سخت مشقت کی زندگی۔ ہم اب بھی اپنے کپڑے خود سیتے ہیں اور کچن میں بہوؤں کے ساتھ برابر ہاتھ بٹاتے ہیں۔''

ان سے مل کر سوچتی ہوں اگر آپ کسی سماج کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں تو محض ایک فرد ہی کتنی مکمل کتاب ہوتا ہے اپنے سماج کو بیان کرنے کے لئے! اماں بہت بے کل تھیں ڈھاکہ اپنے وطن واپس جانے کے لئے مگر حکومت نے پچھلے دنوں علی احسن اور فضل القادر کی شہادت کے باعث ویزوں پر پابندی لگائی ہوئی تھی اس لئے ان کا قیام یہاں مزید طویل ہوگیا۔

وہ تو ایسا کچھ نہیں کہتیں مگر ان سے مل کر اپنے مجرم ہونے کا احساس خوامخواہ ہی شدید ہوگیا۔ وہ پاکستان سے کتنی محبت کرتی ہیں اس مٹی کی خوشبو انہیں اس عمر میں بھی کھینچ کھینچ لاتی ہے۔ میں نے کہا آپ نہ آیا کریں اتنی ضعیفی میں اپنے پاکستان میں موجود بچوں کو بلا لیا کریں۔ تو تڑپ کر بولیں۔ مٹی کی خوشبو مجھے کھینچ لاتی ہے پڑھی لکھی خاتون ہیں اس لئے حالات حاضرہ پر بھی نظر رہتی ہے۔ میں نے پوچھا کہ شہادتوں پر وہاں کے مقامی افراد کا کیا ردعمل ہوتا ہے تو بولیں۔ جس روز ملا عبدالقادر کو پھانسی دی گئی ہم میں سے کسی کو بھی پتہ نہ تھا کہ ایسا ہونے جا رہا ہے مگر جب خبر ملی تو تہلکہ مچ گیا۔ ایسا لگا وہ جنازہ ہمارے ہر گھر سے اٹھا ہے۔ اتنا سخت کرفیو کا سماں جا بجا پولیس اور فوج مگر مظاہرین باز نہ آتے تھے چوک چوراہوں پر جمع ہوجاتے تھے اور پاکستان کے حق میں نعرے لگاتے تھے۔ وہ جتنے چاہیں لاشے پھانسی پر لٹکا دیں مگر پاکستان کی محبت کھرچ نہیں سکتے ہمارے دل سے۔ اندرا گاندھی کا خواب تھا کہ دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق ہوجائے، ہر پھانسی کیا یہ شہادت نہیں دے رہی کہ دوقومی نظریہ زندہ ہے! اخباروں میں تو آیا تھا تم نے بھی پڑھا ہوگا کہ ملا عبدالقادر نے شہادت سے قبل جو دعا کی اس میں پہلے پاکستان پھر بنگلہ دیش کی سلامتی کی دعا کی۔ یہ پاکستان سے محبت کی سزا کے سوا کیا ہے؟ یہ دوقومی نظریے کا تعاقب ہے اور کچھ نہیں۔

مگر انکو بہت دکھ ہے اس بات پر کہ 42 برس قبل اپنے وطن کو متحد رکھنے کی جدوجہد کرنے والوں پر جو قیامت وہاں بیت رہی ہے پاکستان میں لوگوں کو اس کا علم تک نہیں۔ کہتی ہیں بنگلہ دیش میں پاکستان سے محبت کرنے والے جو کچھ بھگت رہے ہیں اور اب تو موت اور عمر قید کی سزا پا رہے ہیں وہ پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں مگر مایوس ہوتے ہیں یہاں کی

حکومت اور عوام سے جس جوابی ردعمل کی انہیں توقع تھی وہ مایوس کن رہا ہمیشہ۔

وہ بولیں میری جس سے بھی بات ہوتی ہے لوگ کہتے ہیں یہ بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ ہے تو میرا دل بہت دکھی ہو جاتا ہے۔ پاکستانی قوم کیوں نہیں سمجھتی کہ یہ تو پاکستان کے نظریے کے تقدس کا معاملہ ہے۔ آخر ان لوگوں نے پاک فوج کے ساتھ مل کر ملک کی بقا کی جنگ لڑی تھی۔ دنیا کے کون سے قانون میں اپنے وطن کا دفاع کرنے والے جنگی مجرم قرار پاتے ہیں۔ مگر حسینہ واجد یکے بعد دیگرے انتقام کی آگ میں جنگی جرائم کا راگ الاپ کر محب وطن لوگوں کو تختہ دار پر لٹکا رہی ہے، دنیا میں کہیں مسلمان اس طرح احتجاج نہیں کر رہے جیسا ہونا چاہیے پاکستان کی فوج تو ایک بار ہی ہاری تھی بابو۔ مگر ہر پھانسی پر تمہیں لگتا ہے کہ پاکستان کو ایک اور شکست ہوگئی۔ دل ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے ہم نے ان شہادتوں پر اپنے کانوں سے ڈھاکہ کی گلیوں میں نعرے سنے ہیں کہ ''پاکستان سے محبت جرم ہے تو موت بھی قبول ہے۔'' ہر شہادت پر بنگالی سبز پرچم لے کر سڑکوں پر آ جاتے ہیں۔ بنگالیوں کی نئی نسل کے دل سے سبز ہلالی پرچم کی محبت کوئی شہادت بھی نکال نہ سکی۔ یہ نظریے کی محبت ہے اور جیلوں میں بند درجنوں لوگ جو پھانسی کے منتظر یا عمر قید کی سزا بھگت رہے ہیں پاکستان کی محبت ہی تو انکا ایک جرم ہے جو انہیں غدار بنا رہا ہے یا دہشت گرد۔ جبکہ انڈیا تو مکتی باہنی کا ساتھ دینے والوں کو ہیرو کا درجہ دیتا ہے۔ ہم کب کہتے ہیں کہ پاکستان میں ان پھانسی چڑھنے والوں کو توپوں کی سلامی دی جائے یا ڈاک ٹکٹ جاری ہوں یا شاہراہیں ان کے نام سے منسوب کی جائیں مگر جو ہو رہا ہے وہ بھی تو نہیں ہونا چاہیے۔ جس روز عبدالقادر کو پھانسی ہوئی میرے پوتے نے مجھے اپنے موبائل کیمرے پر دکھایا کہ پاکستان میں میڈیا کے سب چینل ہریتک روشن انڈین اداکار کی طلاق کی خبریں بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے۔ نہ سڑکوں پر احتجاج نظر آیا نہ میڈیا پر۔ یہاں کی نئی نسل تو واقف بھی نہیں کہ وہ البدر کیا تھی جس کے جرم میں ان کی پچھلی نسل آج پھانسی کے پھندے پر جھول رہی ہے اور وہ عمر قید تو جیلوں میں بھی ہے اور کیمپوں میں بھی۔ محصورین تو اب یہاں یاد ہی نہیں کسی کو ۔

کتنا دکھ اور کرب ہوتا تھا ان کی گفتگو میں۔ اپنے محسنوں کو بھلانے والوں کا بلاشبہ وہی انجام ہوتا ہے جس انجام کے ہم قریب تر ہو رہے ہیں۔ کیسا طرفہ تماشہ ہے کہ مشرقی پاکستان کب کا مرحوم ہوا۔ ڈھاکہ ڈوب چکا مگر اس کے گلی کوچوں میں آج بھی دو قومی نظریے کی جنگ جاری ہے۔ ہمارا تو وجود ہی ایک ''نظریاتی'' وجود تھا۔ ہم اس نظریے کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے اور سرحد پار سے شفق کی لالی میں شامل خون بار بار تمہیں یاد دہانی کراتا ہے کہ یاد رکھنا تمہارا نظریہ ہی تمہاری بنیاد ہے تمہاری اساس ہے۔!

یہ کیسی بے نیازی ہے کہ ہم اس لہو کو بھول جائیں جو ہمارے لئے بہایا گیا اور ہم نے اسے گناہ کی طرح بھلا دیا۔ یہ کیسا قحط ہے کہ ہمارے پاس انہیں دینے کے لئے لفظوں کا کفن تک نہیں ہے۔!!

جن کی وفائیں ہمارا اثاثا ہیں ہم انہیں پھانسی پر جھولتا دیکھ کر منہ پر اور قلب پر قفل چڑھائے بیٹھے ہیں اور قاتل ریمنڈ ڈیوس کو سزا تک نہ دے سکے جبکہ پھانسی کا حقدار تو وہ تھا۔ مگر ہم اپنے آقاؤں کو کیسے ناراض کر دیتے اور حسینہ واجد بھی اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے اپنی عاقبت برباد کر رہی ہیں ہمارے آقا تو توہین رسالت جیسے جرم پر بھی ریاست کو موت کی سزا کا حقدار دینے پر تیار نہیں۔ تاریخ کے اوراق میں جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہی درج ہے۔ ہم خود اپنی جڑیں کھود رہے ہیں اور فاٹا، سوات اور بلوچستان میں پاکستان اور پاک فوج کا ساتھ دینے والے پختونوں اور محب وطن بلوچوں کو کیا پیغام دے رہے ہیں جو علیحدگی پسندوں اور دہشت گردوں کے مقابلے میں پاکستان کے ساتھ کھڑے ہیں۔؟؟

مہذب دنیا کا کون سا قانون اپنے وطن کے دفاع کو ''جنگی جرائم'' کی فہرست میں شمار کرتا ہے۔ مگر ہم اس عہد میں جی رہے ہیں جہاں بہت سے لفظوں کے مفہوم بدل چکے ہیں، اب ظلم ''صرف وہ ہے جو مسلمان کرے اور ''مظلوم'' صرف وہ ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھوں نشانہ بنے

اور عالمی عدالت انصاف حقیقی مظلوموں کو انصاف دلانے سے عاجز اور ہمارے حکمران عالمی طاقتوں کی چوکھٹ پر سجدہ ریز۔ ورنہ حق تو یہ تھا بنگلہ دیش میں عمر قید اور پھانسی کی سزا پانے والوں کا کہ

☆انکو 21 توپوں کی سلامی دی جاتی۔

☆ان شہیدوں کی یاد میں یادگاریں تعمیر کی جاتیں۔

☆فوجی بینڈ ماتمی دھنیں بجاتے اور قومی سطح پر اسکا اظہار کیا جاتا

۔

☆قومی پرچم سرنگوں کر دیا جاتا۔

☆مشہور شاہراہیں ان کے نام سے منسوب کی جاتیں۔

☆انکے نام کے یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری ہوتے۔

☆ آرمی میوزیم میں ان کی تصاویر آویزاں کی جاتیں۔

☆ پاکستانی میڈیا ان کو ہیرو بنا کر پیش کرتا۔

ان کی ''پہلی محبت'' کا یہ تو کم سے کم قرض تھا ہم پر! اس چراغ غم کی لو کو بجھنے نہیں دینا ہے۔ اگرچہ ماضی تو نہیں بدل سکتا شاید اس کی ضو مستقبل کو کچھ روشن کر دے!

☆......☆......☆

ذکیہ فرحت

عظمت وطن کا شہید

آج کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ انصاف خود عدالت کی دہلیز پر کھڑا انصاف، انصاف پکار رہا ہے

پھر ایک دیا بجھا دیا گیا۔ ایک چراغ پھر گل کر دیا گیا۔ ایک اور روشنی معدوم کر دی گئی۔ ایک اور باب زندگی بند کر دیا گیا۔ دیکھتی آنکھ اور بولتی زبان خاموش کر دی گئی۔ ایک ایسی شخصیت جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھی، بہت سی خوبیوں کا مجموعہ! جو تنہا نہ تھی، بہت سوں کو اپنے پیچھے لے کر چل رہی تھی۔ جو رہنما تھی امیر تھی ایک پوری جماعت کی، ایک نظریہ ایک مقصد اور ایک ہی جذبہ رکھنے والے لوگوں کی۔ جو اٹل ارادے اور پہاڑ جیسی قوت واستقامت کی حامل تھی۔ آج اس کوہ گراں کو گرا دیا گیا۔ اس قوت کو ڈھا دیا گیا۔ صرف ایک ذات کے جذبہ انتقام کی تسکین کی خاطر۔ ایک بے گناہ کو جبراً گناہگار ثابت کیا گیا۔ تخت اقتدار کے تحفظ کی خاطر راستے سے ہٹا دیا گیا کیونکہ وہ ان کا مدمقابل تھا۔ ہوس اقتدار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا اس لئے ظلم و جبر کے شکنجے میں کس دیا گیا۔

مگر لوگو! دیکھو تو سہی یہ کیسا ظلم ہے، یہ کیسا اندھیر ہے کہ الزام بھی غلط فیصلہ بھی غلط اور فیصلہ کرنے والے بھی غلط، پھر بھی سزا نافذ کر دی جائے۔ ایسا کورٹ جو بین الاقوامی قانون کے دائرے سے باہر ہے، جو عالمی قانون انصاف پر پورا نہیں اترتا، کوئی ایک الزام ثابت نہ ہو سکنے کے باوجود یہ کورٹ ایک بے گناہ کے خون کا فیصلہ کرے ...... یہ خود انصاف کا خون ہے۔ اور آج کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ انصاف خود عدالت کی دہلیز پر کھڑا انصاف، انصاف پکار رہا ہے۔

زاغ و کرگس پر کوئی بندش نہیں
اور شاہیں ہیں کہ زیر دام ہیں

آج بڑے بڑے مجرم، ڈاکو اور قاتل دندناتے پھر رہے ہیں، منصفوں کی ناک کے نیچے تابناک زندگی گزار رہے ہیں مگر کیا شاندار کارکردگی ہے ان منصفوں کی جو 45 سال پرانے مردہ قصے کو زندہ کر کے سزائیں دے رہے ہیں اور وہ بھی ایسی ناکردہ گناہی میں پھانسیوں پر چڑھا رہے ہیں جو کی ہی نہ گئی ایک ایسا جرم جو ہوا ہی نہیں کیونکہ جس چیز کا وجود ہی نہ ہوا اس کی مخالفت جرم کیسے ہو سکتی ہے؟ ملک سے محبت ملک کے ہر شہری کو ہوتی ہے اور ہونی چاہیے وہ بھی اس وقت کے مشرقی پاکستان کے شہری تھے جو اس وقت متحدہ پاکستان تھا۔ بنگلہ دیش دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھا۔ وہ محبت وطن تھے۔ وطن سے محبت، اس کی حفاظت، اس کا دفاع قانوناً جائز تھا۔ انہوں نے حب الوطنی کا اظہار کر کے کوئی جرم نہیں کیا تھا بلکہ فرض ادا کیا تھا سزا تو ان کو ملنی چاہیے تھی۔ جنہوں نے اس سے انحراف کیا۔ اس سے بغاوت کی اور ایک متحد ملک کو توڑ کر اس کے ایک حصے کو الگ ملک بنانے کی کوشش کی۔ مگر جب خرد کا نام جنوں اور جنوں کا فرد رکھ دیا جائے تو پھر حسن کرشمہ ساز سے ایسے ہی کرشمے ظہور میں آتے ہیں۔ افسوس کہ۔

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالاں
طوق زریں ہمہ درگردنِ خرمی بینم

دل سوگوار ہے اور آنکھ اشکبار...... اے کاش ایسا نہ ہوتا! یہ روشن اور فراخ پیشانی جس پر جہد مسلسل کی تحریر کندہ ہے۔ کھلی کتاب کی مانند صاف وشفاف، عشق رسولؐ کا پرتو لئے، سنت رسولؐ سے مزین پرنور اور پروقار چہرہ اس کا مستحق تو نہ تھا کہ اسے یہ صلہ ملتا مگر...... یہی تو صلہ شہید ہے، صلۂ شہید کیا ہے تب وتاب جاودانہ! خاک وخون میں غلطاں ہو کر ہی تو حیات جاوداں حاصل ہوتی ہے۔ مطیع الرحمن تو خدائے رحمان کے مطیع تھے۔ زندگی میں بھی ایسی راہ کے راہی تھے اور اب پھانسی کے پھندے کو طوق گلو بنا کر بھی اسی کی اطاعت میں راہی ملک عدم ہوئے۔

یہ مقام تو ہے ہی شہادت گہہ الفت کا۔ وہ تو اپنے رب کے حضور سرخرو ہو گئے۔ رب رحمان کے نزدیک بلند و برتر مقام پا گئے۔ یہ رتبہ

بلند ہر کسی کو نہیں ملتا۔ ہر بوالہوس کے واسطے دار ورسن نہیں ہوتا

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

خدا ان پر اپنی رحمتیں تمام کرے مگر جاتے جاتے یہ ضرور بتا گئے کہ یہ دنیا فانی ہے اور ہر وہ چیز بھی جو آج کسی کو ملی ہوئی ہے۔ آج ہوس اقدار کے نشے میں بدمست لوگ جھوٹی عدالت لگا کر بے گناہوں کا خون کر کے گردن اکڑائے چل رہے ہیں۔ کل جب اس رب العالمین کی سچی اور آخری عدالت لگے گی تو یہی گردنیں گناہ وندامت کے بوجھ سے جھول رہی ہونگی۔

یہ ظلم تو نیا نہیں کہ ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

آج پھر بولہب اپنا وار کر گیا ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ کسی قصر شاہی، کسی ایوانِ صدر، کسی ہزایکسیلنی کے قصر ابیض کے کسی کونے کسی گوشے سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ کھلے ہوئے اعلانیہ ظلم پر کوئی زبان نہ کھلی۔ محراب ومنبر بھی مصلحتاً خاموش ہی رہے کہ لب کشائی ان کے لئے مصیبت نہ بن جائے حالانکہ یہ تو تقاضائے منصبی تھا۔ مظلوم کی مظلومیت پر آواز اٹھانا ان پر واجب تھا۔ ہاں ایک نحیف سی آواز ایوان حکومت سے بھی سنائی تو دی لیکن پھانسی دیئے جانے کے بعد! شاید انہیں اسی کا انتظار تھا یا شاید ان میں اتنا ہی ظرف تھا!

البتہ اس گہری خاموشی کو توڑتی اور ظلمت شب کا پردہ چاک کرتی ہوئی صرف ایک ہی توانا آواز ابھری جو اس مرد خدا طیب اردگان کی تھی جس نے یورپ کے ایوانوں کو للکارتے ہوئے کہا" کہاں ہیں پھانسیوں کو ظلم کہنے والے؟ آج انہیں یہ ظلم کیوں نظر نہیں آ رہا؟ کیا اس لئے کہ یہ پھانسی ایک مسلمان کو دی گئی ہے؟ ہاں انہیں صرف وہ پھانسی ظلم لگتی ہے جو ان کے مفاد اور مرضی کے خلاف ہو۔ انہیں اندھیرے میں چلا یا ہوا تیر تو نظر آ جاتا ہے مگر دن کے اجالے میں کیا جانے والا ظلم وتشدد نظر نہیں آتا۔ سچ کہا اردگان حق ادا کر دیا مسلمان بھائی ہونے کا۔ دل کو گرما گئی اس کی روح ایمانی سے لبریز آواز۔ زندگی میں حرارت پیدا کر دی اس کی للکار نے۔ اللہ اسے بہترین زندگی عطا کرے۔ دشمنوں سے اس کی حفاظت کرے، ان کی سازشوں سے اسے محفوظ و مامون رکھے۔ اللہ کی عدالت میں اس نے اپنی گواہی لکھوا دی۔ اس نے ثابت کر دیا کہ ابھی مسلمان کا ضمیر بالکل مردہ نہیں ہو گیا، ابھی کوئی چنگاری باقی ہے۔

اور اسی کا تو ڈر ہے دشمنوں کو کہ یہ چنگاری کسی دن شعلہ بن کر ان کے خرمن ہستی کو پھونک نہ ڈالے۔ اسی لئے تو یہ ساری کارروائیاں ہیں اپنے تخت عالم کے قیام واستحکام کے لئے مسلم حکمرانوں کو زیر اور مسلم مملکتوں کو کمزور کیا جا رہا ہے کہ شیر پھر ہوشیار ہو کر ان کے قصر سلطنت کو الٹ نہ دے اور اسی لئے تو بھارت کا حکمران نریندر مودی ابھی چند دن پہلے ان کے درمیان آ کر اعلانیہ خم ٹھونک کر یہ کہہ گیا کہ بنگلہ دیش کو بھارت اس کی فوج اور ہندو بنگالیوں پر مشتمل مکتی باہنی نے بنایا ہے تو یہ کہنا بلا وجہ نہ تھا۔ یہ دراصل یاددہانی تھی، یہ تنبیہہ تھی حسینہ واجد کو کہ ہم نے بنگلہ دیش تمہارے آرام سے حکومت کرنے کے لئے نہیں بنایا ہے۔ سنہری ریشے کی یہ سرزمین یہ سونار بنگلہ تمہیں یونہی بخش نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس لئے کہ یہاں بھارت سرکار کا حکم چلے گا۔ تمہیں میرے حکم پر چلنا ہوگا کیونکہ بنگلہ دیش تم نے نہیں ہم نے بنایا ہے اور اب یہ حسینہ بھارت اسکے حکم کی غلام بن کر محبت وطن لوگوں کو قربانی کا بکرا بنا کر بھولا ہوا سبق یاد کر رہی ہے۔ لیکن شاید وہ اپنے باپ کا انجام بھول گئی ہے جب گھر کے اندر سے باہر سیڑھیوں تک لاشیں تین دن تک پڑی رہی تھیں اور یہ انجام اپنوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ کسی پاکستانی نے یہ کام نہیں کیا تھا۔ اس بھارتی حسینہ کو اپنا انجام بھی یاد رکھنا چاہیے کہ "ظلم پھر ظلم ہے جب حد سے بڑھتا ہے تو ظلم کے ساتھ ظالم کو بھی مٹا دیا جاتا ہے۔

مطیع الرحمن تو اسی زمین کے مسیحا تھے، اسی زمین کی مٹی میں آسودہ خاک ہو گئے۔ قید زندگی سے آزاد ہو کر جہد مسلسل کی تاریخ رقم کر کے بہادری اور وقار کے ساتھ اپنے رب کے حضور پہنچ کر ہنستے مسکراتے چہل قدمی کرتے ہوئے جنت میں داخل ہو گئے ہوں گے بے شک وہ ایک عظیم انسان تھے دنیا کی تاریخ میں اپنا نام سنہری حرفوں سے لکھوا کر اپنے آبائی وطن کی مٹی میں سپرد خاک ہو کر پرسکون نیند سو گئے ہیں کیا پتہ کسی کو یہ مٹی بھی نصیب ہوتی ہے یا نہیں!! ☆

فیرس جبر: ترجمہ: فریدہ خالد

لکھنا اور چہل قدمی

واک کرنے سے ہماری کیمسٹری بدل جاتی ہے۔ ایک نئی ریسرچ جو دماغ کی بہتر کارکردگی میں پیدل چلنے کا کردار سامنے لاتی ہے۔ لکھنے والوں کے لیے خاص تحفہ

قدیم یونانیوں کے وقت سے بہت سے لکھاریوں نے یہ جان لیا تھا کہ لکھنے، سوچنے اور پیدل چلنے ان تینوں کے درمیان ایک بہت گہرا اور وجدانی تعلق ہے۔ مثلاً Henry David Thoreau جو اپنے زمانے کے مشہور رائٹر رہے ہیں لکھتے ہیں، کہ جس لمحے میری ٹانگیں چلنا شروع کرتی ہیں اسی لمحے میری سوچوں کا بہاؤ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ تھامس ڈیکوئنسی کے اندازے کے مطابق ولیم وڈز ورتھ، جو کہ قدرتی مناظر پر شاعری کرنے میں مشہور تھے، وہ اپنی زندگی میں تقریباً ایک سو اسی ہزار میل ((180000 چلے تھے جو کہ تقریباً ساڑھے چھ میل روزانہ بنتا ہے اگر ایک انسان پانچ سال کی عمر سے روزانہ اتنا چلنا شروع کرے۔

سو پیدل چلنے میں ایسا کیا ہے جو آپ کو سوچنے اور لکھنے میں مدد کرتا ہے؟ اس کا جواب شروع ہوتا ہے اس بات سے کہ واک کرنے سے ہماری کیمسٹری میں تبدیلی شروع ہوتی ہے۔ جب ہم واک کرتے ہیں تو ہمارا دل تیزی سے دھڑکتا ہے، جس سے ہمارا خون تیزی سے گردش کرتا ہے اور اس طرح آکسیجن تیزی سے نہ صرف ہمارے پٹھوں بلکہ تمام اعضا تک تیزی سے پہنچتی ہے جن میں ہمارا دماغ بھی شامل ہے۔ کئی قسم کے تجربات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ورزش کے دوران اور بعد میں، چاہے وہ ورزش ہلکی پھلکی ہی کیوں نہ ہو، لوگوں کو ٹیسٹ کرنے پر معلوم ہوا کہ انکی یاداشت اور توجہ دینے کی صلاحیت میں بہتری آئی ہے۔ واک کرنے سے دماغ کے خلیوں کا آپس میں رابطہ بڑھتا ہے، دماغی خلیوں میں کمزوری جو کہ عمر بڑھنے کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اسے کم کرنے، hippocampus (دماغ میں یادداشت والا حصہ) کو بڑھانے اور ان مالیکیولز کی سطح کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جو کہ نئے نیورونز کی نشونما اور ان کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ جس طرح سے ہم اپنے جسم کو حرکت دیتے ہیں وہ ہماری سوچوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور جواباً ہماری سوچ ہمارے جسم کی حرکات پر اثر ڈالتی ہے۔ وہ نفسیات دان جنھوں نے ورزش کی موسیقی میں اسپیشلائز کیا ہے وہ ہمیں وہی باتیں اس سلسلے میں بتاتے ہیں جو شائد ہم میں سے بہت لوگوں کو معلوم ہوں گی۔ جیسا کہ تیز ٹیمپو کے گانے ہمیں تیز بھاگنے پر اکساتے ہیں اور جس تیزی سے ہم چلتے ہیں اسی قدر تیز میوزک کو ہم ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی ڈرائیور تیز میوزک کو سنتا ہے تو نادانستہ طور پر اسکے پاؤں ایکسیلیٹر پر زور سے پڑتے ہیں۔ مگر واک کرنے سے ہمارے جسم اور دماغی حالت کے درمیان ایک ایسا خاص تعلق پیدا ہوتا ہے جو کہ ہم کسی جم میں جاگنگ کر کے، کار یا سائکل چلا کر یا کسی بھی قسم کی حرکت کرنے سے حاصل نہیں کر سکتے۔ جب کبھی ہم ٹہلنے یا سیر کرنے نکلتے ہیں تو ہمارا موڈ قدرتی طور پر ہمارے پاؤں کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتا ہے اور ہمارے اندر کی آواز اسکی لے پر تھر تھرانے لگتی ہے۔ اس وقت ہم شعوری طور پر اپنی سوچوں کا رخ اپنی رفتار کے مطابق تیز یا آہستہ کر سکتے ہیں۔

چونکہ ہمیں چلنے کے لئے کوئی خاص ذہنی تگ و دو نہیں کرنی پڑتی اسی لئے ہمارا ذہن آزادگھوم رہا ہوتا ہے یا یہ کہیں کہ آوارہ گردی کر رہا ہوتا ہے، اور ہمارے ذہن کی اسکرین پر بہت سی تصاویر بھاگتی دوڑتی نظر آتی ہیں۔ شاید اسی ذہنی حالت کو مختلف اسٹڈیز میں جدید خیالات اور آگہی یا ادراک پر ایک کاری ضرب لگانے سے جوڑا گیا ہے۔ اس سال کے شروع میں اسٹینفورڈ کے میریلی اوپیزو اور ڈینیئل شوارٹز نے ایک مضمون شائع کیا ہے جو کہ شاید سب سے پہلی ریسرچ اسٹڈی ہے جس میں اس بات کو جانچا گیا ہے کہ واک کے دوران کس طرح تخلیقی صلاحیتیں تبدیل ہوتی ہیں۔ انہیں اپنی ریسرچ کے لئے یہ خیال بھی واک کرتے

ہوئے ہی آیا۔ اوپیزو نے شوارٹز کے متعلق جو کہ ان کے پی ایچ ڈی سپروائزر تھے، بتایا کہ شوارٹز اپنے طلبہ کے ساتھ واک کرنے اور اس دوران سوچ بچار اور تبادلہ خیال کرنے کے عادی تھے۔ ایک دن جب ہم واک کر رہے تھے ہمیں ایک ریسرچ کرنے کا خیال آیا۔ یہ ریسرچ چار تجربات کے سلسلے پر مشتمل تھی۔ اس میں 170 طلبہ کو تخلیقی سوچ کے مختلف اقسام کے ٹیسٹ دیئے گئے جو انہیں یا تو بیٹھ کر، یا ٹریڈمل پر چلتے ہوئے یا یونیورسٹی کے کیمپس میں آوارہ گردی کرتے ہوئے حل کرنے تھے۔ ایک ٹیسٹ میں شرکت کرنے والے رضا کاروں کو یہ کہا گیا تھا کہ وہ عام استعمال کی اشیا مثلاً بٹن یا ایک ٹائر کے روزمرہ کے استعمال کے بجائے ان چیزوں کے چند ایک غیر معمولی استعمال بتائیں۔ ہر طالبعلم نے اس وقت کی نسبت جب انہوں نے بیٹھ کر سوالات حل کئے تھے، واک کرتے ہوئے اوسطاً چار سے چھ زیادہ غیر معمولی استعمال بتائے۔ ایک اور ٹیسٹ میں رضا کاروں سے کہا گیا کہ وہ ایک استعارہ یا کہاوت، مثال کے طور پر "a budding cocoon," پر غور کریں اور اس سے ملتا جلتا مگر منفرد استعارہ یا کہاوت بنائیں۔ ۹۵ فیصد وہ طلبہ جنہوں نے واک کرتے ہوئے اس پر غور کیا وہ اس میں کامیاب ہوئے جب کہ وہ جو بیٹھے رہے ان میں سے صرف ۵۰ فیصد ایسا کر سکے۔

لیکن کچھ اس قسم کے ٹیسٹ بھی ہیں جنہیں اگر واک کرتے ہوئے حل کیا جائے تو لوگوں کی کارکردگی متاثر بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک ایسا لفظ تلاش کرنا جس سے تین ایک ہی طرح کے مطلب نکل سکتے تھے یا وہ ایک لفظ تین مختلف چیزوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہو جیسے کہ پنیر کے لئے تین دوسرے الفاظ کاٹیج ، کریم یا کیک بھی ہوتے ہیں ۔ اوپیزو کا خیال ہے کہ مرکوز سوچوں پر واک کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر آپ کو کسی ایک آئیڈیا پر فوکس کرنا ہے تو پھر آپ نہیں چاہیں گے کہ آپ کے ذہن میں مختلف خیالات ابھرتے رہیں۔

اس سے بھی فرق پڑتا ہے کہ ہم کہاں واک کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی آف ساؤتھ کیرولائنا میں مارک برمن کے زیر اہتمام کی جانے والی ایک ریسرچ میں معلوم ہوا کہ وہ طلبہ جنہوں نے کسی باغ یا درختوں کے کنارے چہل قدمی کی، یاداشت کے ٹیسٹ میں ان کی پرفارمنس، ان طلبہ سے بہتر رہی جنہوں نے شہر کی سڑکوں پر واک کی۔ کئی ایک ریسرچز سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سبزہ زاروں مثلاً باغات، پارکوں اور جنگل میں وقت گزارنے سے ذہنی صلاحیتیں جوان رہتی ہیں جو کہ شور ہنگامے کے ماحول میں ختم ہو جاتی ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ انسانی توجہ محدود وسائل پر مشتمل ہوتی ہے جو کہ دن بھر کم ہوتی جاتی ہے۔ چوراہے، لوگوں کا ہجوم، ہنگامے، کاریں اور بل بورڈز ہماری توجہ ادھر ادھر کر دیتے ہیں۔ جبکہ ایک پارک میں جھیل کے کنارے چلنا، ہمارے ذہن کو آہستگی سے ایک منظر سے دوسرے کی طرف لے جاتا ہے۔

مگر اس کے باوجود واک چاہے شہری ہو یا ایک چرواہے کی ہو وہ ذہن کو انوکھے فائدے دیتی ہے۔ کسی شہری علاقے کی واک فوری محرک کا کام دیتی ہے، ذہن کو بہت سی ورائٹی دیتی ہے۔ لیکن اگر ہم پہلے ہی سے بھرپور اکساہٹ (stimulation) کے کنارے پر ہیں تو پھر ہم قدرت کی طرف رخ کر سکتے ہیں۔ وولف نامی ایک خاتون اپنی ڈائری میں لندن کی سڑکوں میں پھیلی لذت کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ جیسے وہ سب سے بڑی لہر کی چوٹی پر، تیرتی ہوئی چیزوں کے بالکل درمیان میں ہے۔

شاید چہل قدمی کرنے، سوچنے اور لکھنے کے درمیان جو تعلق ہے وہ ٹہلنے کے اختتام پر ایک ڈیسک کے پیچھے ظاہر ہوتا ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ واک کرنا، اور لکھنا ذہنی اور جسمانی طور پر ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملتے جلتے کام ہیں۔ جب ہم کسی شہر یا جنگل سے گزرتے ہیں تو ہمارا دماغ ہمارے اردگرد کا جائزہ لینا شروع کر دیتا ہے، ذہن میں دنیا کا ایک نقشہ بناتا ہے، آگے قدم بڑھانے کا ایک پلان بناتا ہے اور پھر اس پلان کو اپنے قدموں کی ایک سیریز میں ڈھالتا ہے۔ بالکل اسی طرح لکھنے کی تحریک ہمارے دماغ کو مائل کرتی ہے کہ ہم اپنی زمین کی خوبصورتی کا جائزہ لیں، اپنی سوچوں کے دھارے کو کوئی شکل دیں، اور سوچوں کی اس پگڈنڈی کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے لکھیں یا نقل کریں۔ چلنا ہمارے اردگرد کی دنیا کو منظم کرتا ہے جب کہ لکھنا ہمارے خیالات کو منظم کرتا ہے۔

Why Walking Helps Us Think. by Farris Jabr in

New Yorker, September, 03, 2014 سے ماخوذ۔☆

☆......☆......☆

فطرت کو مسخ ہونے سے بچائیں

''یار تو carmagaddo کے آخری راؤنڈ میں 3500 کو ہلاک کر کے پہنچ گیا۔کیا واقعی؟؟؟ میں تو دس دنوں سے لگا تار کوشش میں ہوں مگر فائنل راؤنڈ میں پہنچ نہیں پاتا۔''

انس نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے کلاس فیلوظفر سے کہا۔''یار تھا تو میرے لیے بھی بہت مشکل کبھی رحم کی درخواست کرنے والوں پر ترس آجاتا اور کبھی چیخ و پکار کرتے گڑگڑاتے پنجوں کے بل بیٹھ کر زندگی کی بھیک مانگنے والوں کے سامنے بے بس ہو جاتا اور کبھی خون خوار مناظر میرے ہاتھ روک لیتے مگر بھیا کے کہنے پر حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے کل تو خوب مذاق اڑایا تھا کہ یار تیرا دل تو چڑیا جتنا ہے یہ حقیقت میں لوگ مرتے تھوڑی ہیں اور نہ ہی خون حقیقی ہے یہ تو گیم ہے گیم۔بس پھر میں بھی فائنل راؤنڈ میں پہنچنے کی دھن میں شاٹ گن سے بھونتا آگے بڑھتا چلا گیا۔میرا دل تو بجھ سا گیا تھا۔مگر بھیا کو میری مہارت دیکھ کر بڑا لطف آیا۔''

☆......☆......☆

سیون ڈی سینما کا ویٹنگ روم نوعمر لڑکے اور لڑکیوں سے فل تھا۔ اگلی فلم Rapidcoaster تھی،اس کے بعد ایک horror مووی دکھائی جانی تھی وہ تمام ہارر مووی کے منتظر آپس میں باتوں میں مصروف تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ریپڈ کو سٹر تیز ترین کوسٹر ہیں ساتھ لئے خطرناک ترین راستوں اور کھائیوں سے گزرتی بلند سے بلند ہوتی کہ اچانک راستہ کٹنے پر گر پڑتے۔راستے میں کئی خطرناک پرندوں جانوروں سے بھی سامنا ہوا سب کچھ حقیقت نہ ہوتے ہوئے بھی ڈرا اور خوف محسوس ہوتا تھا ہارر مووی کے پوسٹر پر بنی تصاویر ہی سے اس کے ڈراؤنے پن اور خوفنا کی کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ اس کی شروعات پر ہی اندر بے تحاشا چیخ و پکار ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی مجھے فکر ہوئی مگران کے آپس کے جملوں کے یاد آنے پر میں اپنی راہ چل دی وہ کہہ رہے تھے ہمیں ڈراؤنی اور ایسی موویز پسند ہیں جن میں پلک جھپکنے کی تیزی ہو،ہلچل ہو،چیخ و پکار اور شور ہو۔لڑائی جھگڑا خون خرابہ ہو اس سے ہمیں ڈر نہیں لگتا خوب مزا آتا ہے یہ عام موویز سب بے کار، بورنگ ہیں۔

☆......☆......☆

''میں تو اسکول چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔عجیب شرم وحیا سے بے گانہ بچے ہیں آج کے۔ جسمانی ہیئت پر بھی کمنٹ پاس کرتے ہیں۔''مس فلزا نے اپنی کولیگ سے کہا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں آپ ہمارے اسکول میں آکر دیکھیں دماغ ٹھکانے آجائے گا۔ٹوبیکو ان کی روٹین میں شامل ہے جبکہ اب سگریٹ بھی علانیہ پینے لگے ہیں۔عجیب وحشت نظر آتی ہے ان آنکھوں میں ننھے بچوں تک کے چہروں سے معصومیت دور ہونے لگی ہے۔''

''نہ جانے ان کے والدین کس دنیا کے باسی ہیں! گاڑی ڈرائیور ،نوکر تعیشات اور پیسے دے کر سمجھتے ہیں کہ بس ان کے فرائض یہیں تک ہیں۔گیمز اور سوشل میڈیا نشے کی دلدل میں دھنسے ان بچوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔دین سے تو ہیں ہی یکسر لاتعلق اور بے گانہ شاید ہی دنیا کے بھی قابل بچیں۔''

اس وقت ویڈیو،کمپیوٹر اور موبائل گیمز انتہائی عام ہیں مغربی مما لک خصوصاً امریکہ ان گیمز کے فروخت کنندہ میں ٹاپ پر ہیں جو اس صنعت سے نہ صرف اربوں ڈالر کماتے بلکہ اپنے تخریبی مقاصد پورے

کرتے ہیں۔ان گیمز کی پہنچ اوراثر پذیری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انتہائی پسماندہ دیہات میں، ہوٹلوں، کیسینوں، دکانوں یہاں تک کہ ٹھیلوں پر بھی میسر ہیں یہ گیمز دس ہزار سے زائد انواع و موضوعات پر مبنی ہیں جن میں سے کچھ مثبت اور زیادہ تر منفی اور خطرناک ترین رجحانات پر مبنی ہیں۔

بعض گیم تشدد سے بھرپور خون خرابے کے گرد گھومتے ہیں۔بعض پرکشش انداز میں جنسی جرائم کی عکاسی کرتے اور اخلاق وکردار کا مختلف انداز میں جنازہ نکالتے ہیں۔ایک بڑی مقدار ایسے گیمز کی ہے جس میں کھلے عام بد دیانتی اور قانون کی خلاف ورزی دکھائی جاتی ہے کچھ میں زبان لغو اور گھٹیا استعمال کی جاتی ہے اور کتنے ہی ایسے بھی ہیں جو بے حیائی کے مظاہر پر مشتمل ہیں۔

قابل فکر اور تشویشناک بات یہ ہے کہ ان گیمز کا شکار معصوم انسانی ذہن ہیں۔تین سے اٹھارہ سال تک کے بچے یہ گیمز کھیلتے ہیں۔اخلاق و کردار کی تباہی کا سامان تو ان گیمز میں موجود ہے ہی ساتھ ہی ساتھ ذہنی وجسمانی مغلوبیت کا سبب بن رہے ہیں۔سوشل میڈیا پر کریمنل کیسز کو حل کرنے کے نام پر یوتھ بھی اس جانب مائل ہو رہی ہے۔ایک امریکی ماہر نفسیات اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''ہم کمپیوٹر گیم کو محض کھیل سمجھتے ہیں لیکن بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ ہمارے معاشرے کو غلط سمت لے جا رہے ہیں اور ہم اپنے بچوں کو کمپیوٹر کے ذریعے وہ سب سکھا رہے ہیں جسے کوئی شخص شاید حقیقی زندگی میں ساٹھ سال تک ہتھیار کا میگزین لوڈ کرنا نہ سیکھ پائے لیکن ایک بچہ کمپیوٹر کی مدد سے نہ صرف یہ کہ جدید ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانوں اور دوسری جاندار اشیاء کو گولیوں سے چھلنی کرنا بھی سیکھ لیتا ہے۔''

اس وقت مارکیٹ میں نئے آنے والے گیمز میں فائٹنگ گیمز کی مانگ سب سے بڑھ کر ہے جس میں ہر طرح کا تشدد اور جرم کا عنصر موجود ہوتا ہے۔اس طرح کے ہزاروں گیمز مارکیٹ میں دستیاب ہیں جن کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔بسا اوقات یہ گیم مہینوں پر محیط ہوتے ہیں۔

بچوں کی معصومیت اور ان کے شاندار مستقبل کے قاتل یہ گیم نہ صرف ان سے ان کی زندگی کا بنیادی اور قیمتی ترین حصہ چھین رہے ہیں بلکہ اس کے پس پردہ معاشرے کے لئے ایسا ناسور تیار ہو رہا ہے جس کے بھیانک پن کا تصور بھی محال ہے۔بڑھتے ہوئے بچوں کی بہتر نشوونما اہم ترین ضرورت ان کا ہم عمر دوستوں سے کھیلنا معصوم معاشرتی تعلقات استوار کرنا، بھاگنا، دوڑنا، شرارتیں کرنا، آپس میں صبر، برداشت اور محبت و لگاؤ کا مظاہرہ کرنا، چھوٹی چھوٹی قربانیاں دینا، شیئرنگ کرنا، رونا، جھگڑا کرنا اور پھر مان جانا یہ گیمز ہر متحرک ختم کر کے نہ صرف جسمانی نشوونما میں حارج ہیں بلکہ بچوں کو سر درد قوت بینائی کی کمزوری، کمر درد، ٹانگوں کا درد، سستی، کاہلی نیند میں خلل جیسے عارضوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔

انسان ہونے کے ناطے فطری طور پر موجود جذبوں، محبت الفت رحم، میل میلاپ، درد، احسان مندی، خدمت، ایثار، قربانی، تشکر کے قاتل ہیں۔

یہ گیمز انہیں تشدد، قتل وغارت، چیر پھاڑ، خون ریزی کی تربیت دے کر درندہ بنا رہے ہیں، انہیں حیاء سے عاری کر کے جانوروں کے سانچے میں ڈھالنے لگے ہیں۔ایسے میں حکومت کی کیا ذمہ داری ہے؟ والدین کو کیا کرنا ہوگا؟ مائیں جگر گوشوں کو اس فتنہ عظیم سے کیسے بچائیں؟ یہ ہر ایک کے اپنے دائرہ کار میں سوچنے کا کام ہے کہ جو جس درجے کا راعی ہے اس سے اسی کے مطابق جوابدہی ہوگی۔

گیمز سوشل میڈیا، الیکٹرانک میڈیا میں بچوں کی حد سے بڑھتی دلچسپی میں ان کا کردار بہت اہم ہے بچہ ان میں کھو کر ماں اور اسے لاتعلق ہو جاتا ہے اور ماں ظاہری سکون میں رہ کر بھیانک نتائج سے بے خبر ہے۔اس وقت معاشرے میں بڑھتی بے رحمی، تشدد، بے حسی پریشان کن ہے گیمز اور اسی جیسے انسانیت کش اقدامات کو نہ روکا گیا تو ہماری آئندہ

نسلیں ہمیں معاف کریں نہ کریں، اللہ تعالیٰ تو ضرور جوابدہی کریں گے۔

اس وقت معاشرے میں ایک اور رجحان خطرناک تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وہ یہ کہ لمحوں میں سب کچھ حاصل کرنے کا جنون ہے۔ پہلے ہی مرحلے پر چھلانگ لگا کر اونچائی کا خواب حقیقت سے نظریں چرانے کے مترادف ہے۔ ایسے میں بنیادی اخلاقی اصول نظر انداز ہو جاتا ہے۔ حلال اور حرام کی تمیز باقی نہیں رہتی اور انسان مادیت کے لامحدود چکروں کی نظر ہو جاتا ہے۔ اسلام متوازن اور اعتدال پر مبنی رویوں اور رجحانات کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی بنا پر نہ تو کوئی شخص امید کا دامن چھوڑتا ہے اور نہ ہی مایوسی کی گہرائیوں میں گر کر خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے۔

اس وقت میڈیا، گیمز، کارٹون معصوم بچوں میں جذباتی، نفسیاتی روحانی اور جسمانی عدم توازن کو جنم دے رہے ہیں۔ بچہ انگلی کی ٹپ پر سب کچھ حاصل کرنے کا عادی بن رہا ہے۔ اس کی قوت فیصلہ بھی اس سیلاب میں بہہ رہی ہے۔ وہ خود سے کچھ سوچنے کچھ کرنے کا وقت ہی نہیں پاتا۔ وہ جادوئی ٹوٹکوں کے ذریعے توانائی کا ایسا سرچشمہ بننا چاہتا ہے کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہوتا چلا جائے۔ طاقت کی یہ بھوک اس وقت کی دنیا کی غالب تہذیبوں کی دی ہوئی ہے جسے ہمارے بچوں میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

ہمارے بچوں کی معصومیت اور صاف ستھری فطرت ان تمام خرافات کی زد میں آ کر بری طرح بگڑ رہی ہے۔ ہم سب کو اپنی اپنی جگہ بچاؤ کی تدابیر کرنی ہوں گی۔

☆......☆......☆

محشرِ خیال

نجمہ یاسمین یوسف۔لاہور

بتول کے اکاسی صفحات میں مختصر وقت میں قاری کو نا صرف کئی دینی کتب سے استفادے کا موقع مل جاتا ہے بلکہ ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ''ابتدا تیرے نام سے'' دل کو گداز اور ذہن کو کشادہ کرنے کا فریضہ بھی ادا کر دیتا ہے۔ روزنامہ جنگ میں انصار عباسی کا کالم'' کاش مجھے یہ سب نہ لکھنا پڑتا'' پڑھا تو میں بھی اور ہزاروں ماؤں کی طرح خون کے آنسو روتی رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ دل و دماغ کے ساتھ روح بھی بے طرح زخمی ہوگئی ہے۔ سوچتی تھی کہ جب ہمارے تعلیمی ادارے ہی حیا اور پاکیزگی کی سرعام دھجیاں بکھیرنے پر تل جائیں تو نسل کی سرخروئی کی دعائیں کیسے مستجاب ہوں؟ مگر بتول'' کے مئی کے شمارے میں محترم حافظ یوسف سراج '' کا مضمون'' روشنی گھر میں مظاہرہ۔ شکریہ ہماری بچیو!'' پڑھ کے یوں لگا جیسے جناب نے زخموں پہ ٹھنڈے پھاہے رکھ دیئے کس دردمندی، کس نرم خوئی، کیسے کیسے تاریخی استدلال اور مفکرانہ انداز سے بچیوں کو مخاطب کیا ہے کہ ان کی اس تحریر کی ستائش و توصیف اور اثر پذیری کی تحسین کے لئے مجھ کم مایہ کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بس دعا ہے کہ ایسے فتنوں کی سرکوبی کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے ہی مجاہدین کی قیادت نصیب فرمائے آمین۔

جناب حبیب الرحمن صاحب کی حوصلہ افزائی پر بہت ممنون ہوں ، ذرہ نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ ان کی شاعری پر اس وقت اتنا ہی کہنا مناسب ہے کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ'' اس سے زیادہ اگر لکھا تو ڈر ہے ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کے زمرے میں نہ آجائے۔

☆......☆......☆

حبیب الرحمان۔کراچی

آپ کمال اداریہ لکھتی ہیں۔ کیا اعلیٰ آزاد نظم ماخوذ کی ہے اور اس نظم کے بعد مختصر مگر جامع تنقیدی نوٹ اس سے بھی خوب ہے۔ لگتا ہے پاکستان میں اعلیٰ سے اعلیٰ حکومتی شخصیت ہو، یا بیشتر سیاسی اور مذہبی جماعتیں، سب کے سب کسی نہ کسی غیر ملکی و ملکی مورت کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے ہیں اور اگر کچھ صدائے احتجاج بلند بھی کرتے ہیں تو ان کا انداز معذرت خواہانہ سا لگتا ہے۔ سواسی قسم کے ہر واقعہ کے بعد ایسا ہی ردعمل دیکھنے میں آتا رہا ہے۔ امریکن سفارت خانے کا گھیراؤ اگر مشکل ہو جائے تو امریکہ کا جھنڈا ضرور نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ کیا بنگلہ دیش کا پرچم جلانے کا کوئی واقعہ ہوا؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

اصل میں جب مرض بڑھ جاتا ہے تو پھر وہ لا علاج ہو جاتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے فوراً بعد اگر کوئی مثبت اور سخت قدم اٹھالیا جاتا تو ممکن تھا کہ وہ تمام پاکستانی جو آج تک'' پاکستانی کیمپوں'' میں پاکستان کی محبت کو اپنے سینوں میں بسائے اور سجائے بہت کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں، وہ اور جماعت اسلامی کے محب وطن پاکستانی بھی یا تو پاکستان میں ہوتے یا کسی معاہدے کے تحت اچھی اور باعزت زندگی گزار رہے ہوتے۔

جس مخصوص لابی کا آپ ذکر کر رہی ہیں اور جو اسلامی نظریاتی کونسل کے خلاف صف آرا ہے اب وہ ایک لابی نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑا عفریت بن چکی ہے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کا حجم بڑے سے بڑا ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس کو دودھ پلانے میں پگڑی والے، بوٹ والے اور سوٹ والے سبھی شامل ہیں۔

رہی یہ بات کہ خواتین پر بڑھتے متشددانہ واقعات میں اضافہ، واقعی ایک تشویشناک بات ہے لیکن میں یہ بھی خیال کرتا ہوں کہ کم ازکم پاکستان میں اس مسئلے کا حل ممکن نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان

میں جتنی بھی نسلیں اور قبائل آباد ہیں اور جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اس دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں ان کے نزدیک اس قسم کے واقعات کوئی جرم ہی نہیں بلکہ یہ غیرت وحمیت کے عین مطابق ہیں۔

اس بات کا اندازہ اُس ماں کے مطمئن چہرے سے لگایا جا سکتا ہے جس نے اپنی بیٹی کو خود ہی نذرِ آتش کیا ہو اور پرسکون ہو یا اُس بھائی سے جو اپنی بہن پر چھریوں کے وار کر کے تڑپتا ہوا اٹھا کر فٹ پاتھ پر رکھ کر ویڈیو گیم کھیل رہا ہو اور پکڑے جانے پر بھائی اور باپ کا پولیس کے سامنے یہ کہنا کہ جو کچھ بھی ہوا وہ ٹھیک ہوا۔ جس معاشرے میں ایک جیب کترے کو پکڑ کر پورا بازار اس کو بے دردی سے مار رہا ہو، لیکن وہی محلہ اور بازار کسی ایسی شقی ماں یا بھائی کو چھو بھی نہیں رہا ہوتا تو پھر یہ بات با آسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ معاشرے کے نزدیک کونسا جرم بڑا اور لائق تعزیر ہے؟

اس کے لئے سخت قوانین بننے چاہئیں، درست، مگر یہ قوانین بھی تو اسی معاشرے کے منتخب لوگ ہی بنائیں گے۔۔۔ تو بھلا کیوں بنائیں گے؟ اور قوانین بن بھی گئے تو کیا اسی معاشرے سے تعلق رکھنے والے قانون نافذ کرنے ادارے اس پر عمل درآمد کرائیں گے؟

مطیع الرحمن نظامی کی شہادت پر لکھی گئی آمنہ رمیصاءؔ زاہدی کی نظم بہت خوبصورت اور دل پر اثر کرنے والی ہے۔ اللہ مطیع الرحمن نظامی کو شہداء کے ساتھ اٹھائے (آمین)۔ نیر کاشفؔ کی نظم اپنے عنوان ''خاموشی کا شور'' کی طرح منفرد لگی۔ نیر کاشف کا یہ شعر حقیقت سے قریب بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ ملاحظہ کریں ''کہتی رہ گئی'' میں کیا کچھ کہہ دیا گیا

دنیا مجھ سے کہتی رہ گئی
صبر کرو سب اچھا ہوگا

کرامت بخاری کی غزل کا مطلع، صہیب اکرام کا مقطع اور ذکیہ فرحت کی غزل کا آخری شعر بہت دل کش اور خوبصورت لگے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆......☆......☆

فریدہ خالد۔ کراچی

کافی عرصے سے بتول پر تبصرہ کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن آن لائن میگزین تین ماہ بعد ملتا تھا، جب تک تبصرے کا وقت گزر چکا ہوتا تھا۔ مئی کا میگزین ایک مہربان دوست کے پاس سے مجھ تک ۲۶ مئی کو پہنچا تو سوچا کہ کچھ لکھ بھیجوں۔ سب سے پہلے تو میگزین بھیجنے اور بھجوانے میں شامل تمام لوگوں کے لئے دل سے دعا ہے کہ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

گزشتہ شماروں میں 'نیویارک میں چند روز' پڑھتے ہوئے، ہر مرتبہ نیو یارک میں اگست ۲۰۰۱ میں گزارے اپنے چند ہفتے یاد آ گئے۔ اس وقت تو ٹوئن ٹاورز بھی موجود تھے اور ستمبر کے شروع میں گھر آ کر سب کو تصویریں دکھاتے ہوئے مجھے یاد ہے کہ میں نے خالد (شوہر) سے ناراض ہوتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں ٹاورز کی تصویں کیوں لی ہیں، میں وہاں کھڑی رہی اور آپ ٹاورز کی تصویں لیتے رہے۔ انہوں نے بڑے رسان سے کہا تھا کہ یہ اتنے اونچے ہیں کہ اگر تمہاری تصویر لیتا تو ان کی اونچائی پوری آ ہی نہیں سکتی تھی اس لئے صرف ان ہی کی تصویر لی ہے، اور یہ کہ تمہیں کیا معلوم کہ یہ ٹاورز کیا ہیں۔ واقعی مجھے کیا معلوم تھا کہ چند ہی دنوں بعد یہ خود تو گر جائیں گے اور مسلمان ملکوں پر ان کے گرنے سے قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس کے علاوہ یہ کہ صائمہ صاحبہ نے بالکل درست کہا کہ امریکہ بہادر ہر سال ہمارے کتنے ہی ذہین نوجوان اڑا لے جاتا ہے۔ جو نہیں جا سکتے وہ ترستے رہتے ہیں اور ہمارے جیسوں کو صرف دوسرے ہی نہیں بلکہ اپنے بچے بھی بیوقوف سمجھتے ہیں کہ اتنا اچھا موقع گنوا دیا، آج ہم سب امریکی شہری ہوتے اور مزے کر رہے ہوتے۔ بہرحال ہمیں اپنے پلٹنے پر کوئی ملال نہیں ہے۔

مئی کے شمارے میں حضرت عائشہؓ کا طریقہ تعلیم (بینا خالدی)، دو عظیم ہار (افشاں نوید) اور سید انسانیت ﷺ اور حقوق نسواں (پروفیسر محمد اکرم) بہترین ہیں۔ حافظ یوسف سراج کا منتخب کالم تو دل کو بہت افسردہ کر گیا۔ بس ایسا ہی ہے کچھ ہمارے بچوں میں لیکن ہمیں دیکھنا ضرور ہے کہ ہم سے غلطی کہاں ہو رہی ہے اور یہ کہ ہم سب مل کر اسے کس طرح

دور کر سکتے ہیں۔مل کر اس لئے کہ یہ کام اکیلے نہیں ہوسکتا۔

بتول کو دنیا بھر میں اردو پڑھنے والوں تک پہنچانے کے لئے تین مشورے دینا چاہتی ہوں۔ پہلا یہ کہ ریسرچ گیٹ پر جب بھی میں اپنا بتول میں شائع شدہ مضمون ڈالنا چاہتی ہوں وہ پورا میگزین ڈاؤن لوڈ کر دیتا ہے اور بعد میں جب میں اسے کلک کرتی ہوں وہ غائب ہوتا ہے۔ اسکی وجہ سے دو مسئلے ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب میری کوئی ساتھی میرا مضمون پڑھنا چاہتی ہے تو اس کو پورے میگزین میں مضمون کو ڈھونڈ نا پڑتا ہے جو کہ انہیں مشکل لگتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کئی دفعہ ڈاؤن لوڈ کرنے کے باوجود بھی وہ غائب ہو جاتا ہے۔ جبکہ ایک انگلش مضمون جو کہ اپنی ساتھیوں کے ساتھ لکھا تھا اسے ایک مرتبہ ڈاؤن لوڈ کیا اور ہر مرتبہ میری ریسرچ گیٹ سائٹ کے کھلتے ہی خود بخود وہ بھی کھل جاتا ہے اور ایک ماہ میں اسے دنیا بھر میں تقریباً ۳۰۰ ریسرچرز نے پڑھ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بتول تو صرف اردو پڑھنے والے ہی پڑھ سکتے ہیں اور مجھے یہ فیڈ بیک ملتا ہے کہ انہیں میرے اردو مضامین کھولنے میں دشواری ہوتی ہے۔

دوسری چیز یہ کہ جب ایک مضمون کسی کو پڑھنے کے لئے دینا چاہتی ہوں تو بھی کسی ایک مضمون کا پرنٹ آؤٹ لینے میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ہاں مارچ کے میگزین میں بڑی آسانی سے پرنٹ آؤٹ لے لیا تھا۔ اسی کو جاری رکھیں۔ یہ بات آئی ٹی ایکسپرٹ کو جو بتول کو آن لائن ڈالتے ہیں، بہت آسانی سے سمجھ آسکتی ہے۔

تیسری چیز کہ بتول میں نئے لکھنے والوں کے لئے کچھ مستقل رہنمائی ہر شمارے میں ضرور درج ہونی چاہئے۔ عموماً information for authors کے نام سے میں نے ہر اچھے انٹرنیشنل میگزین کے شروع میں اس قسم کی معلومات دیکھی ہیں جو کہ چند جملوں پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن اس سے نئے لکھنے والوں کی بہت رہنمائی اور ایڈیٹر کے کام میں بھی آسانی ہوسکتی ہے۔

بتول ایک بہترین میگزین ہے اور اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے معیار کو قائم رکھتے ہوئے اسے نئے دور کی ضرورتوں کے مطابق اپنے پڑھنے اور نئے لکھنے والوں کے لئے مزید بہتر بنائے۔

☆......☆......☆

عافیہ رحمت۔کراچی

بتول ماشاءاللہ بہت عمدہ ہوتا جا رہا ہے۔اور وقت کا تقاضا بھی ہے۔آج کل ہر وہ چیز ہی خراج پا سکتی ہے جس کا معیار بہت عمدہ ہو۔ افشاں نوید خالہ کے خط نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔اسقدر زرخیز ذہن ایک ہوشیار مومن کی ہی میراث ہوسکتا ہے۔انہوں نے بہت سی تجاویز دی ہیں۔میں ان پر اظہار خیال کر رہی ہوں۔

بتول کا سائز اگر واقعی ڈائجسٹ جتنا ہوتو بہت عمدہ ہو۔ پرس میں رکھنے میں سہولت ہوگی اور تھوڑی صحت بھی اچھی ہو جائے گی۔اس پر غور کریں۔

ہم اپنے زندوں کی قدر کرنا سیکھ جائیں واقعی بہت اہم سوچ ہے اس پر کس انداز میں لکھوانا ہے یہ بہت اہم ہے۔انٹرویو میں بھی یہ سلسلہ ہوسکتا ہے۔ہمارے بہت سے رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کے احسانات ہم پر بہت زیادہ ہوتے ہیں ان کا شکر یہ بھی اس میں شامل ہوسکتا ہے۔ ہمیں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو شکریہ کہنا مشکل لگتا ہے اور کبھی کبھی ہم کسی کی چھوٹی سی عادت سے بہت تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس کا اظہار خیال بھی ہوسکتا ہے۔

بتول ویسے تو واقعی ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ اس کے اندر ایک ہمدرد دوست بھی چھپا ہونا چاہیے جدید ٹیکنالوجی کا بھی تھوڑا حصہ اس میں شامل کریں۔واٹس اپ کے پیغامات، فیس بک رسپانس یا ای میلز وغیرہ اور کچن اور گھر داری کے امور پر باقاعدگی سے کچھ ضرور لگایا کریں کہ عورت کی پہچان ہی یہ ہے۔ بچوں کے نفسیاتی مسائل پر کوئی انٹرنیٹ سے ریسرچ شائع کریں۔غرض آخری صفحے تک دلچسپی باقی رہے۔

☆......☆............☆

زینب وسیم قائم خانی۔کراچی

فرحی نعیم کے فاتح کا ابتدائی نقشہ بالکل حقیقت حال تھا مگر وہ اتنی جلدی کیسے بدل گیا، خیر افسانے میں یہ سب چلتا ہے۔مریم شہزاد کی

بیگموں کی باتیں بھی خوب تھیں۔

فرحین اقبال راؤ صاحبہ نے عکس میں ہمیں ہمارا اصلی چہرہ دکھایا۔ واقعی یہ نئی نسل یہ ہمارا عکس ہی تو ہے۔ بشریٰ راشد خان کی کہانی خالی دامن والدین کے اس عمومی رویے کی مظہر ہے کہ ایک بچے کو سر پر چڑھا لیا جاتا ہے اور دوسرے کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے نتائج بھی سامنے آتے ہیں۔ جویریہ سعید کا امید باقی ہے ایک خیالی شہر کی کہانی مگر حسبِ حال۔ رمانہ عمر نے بڑی خوبصورتی سے اردو کی گت بنانے والے آج کل کے بچوں کی تصویر کشی کی اور خالہ نے کریلے پکائے بھی اور کسی نے کھائے بھی نہیں، افسوس ہوا۔

زینب! ☆ آپ کی ایک نظم اصلاح کے بعد شائع کی جا رہی ہے۔ 60 سالہ تقریب کا مواد ترتیب دے رہے ہیں، وہ بھی ان شاء اللہ پڑھنے کو ملے گا، کراچی میں آپ کے قریب جو ایجنسی ہے ان کا نام پتہ ارسال کریں ہم ان سے پرچہ آپ کو جلدی بھجوانے کی درخواست کر دیں گے۔ (مدیرہ)

ایک حقیقی سکرپٹ

ایک اشتہار کا اسکرپٹ۔ ماں، بیٹی باپ اور تماشائی سب اداکار۔ لیکن اگلے اسکرپٹ میں کردار سب حقیقی ہیں۔ ہر آنسو سچا، ! ہر آہ کھری، ہر خواب حقیقی !!

یہ تئیس مارچ اُنیس سو ستانوے کو پنجاب کے شہر مُلتان میں پیدا ہونے والی حلیمہ رفیق کی کہانی ہے۔ حلیمہ کے ساتھ بھی اُسی سیلیکشن کیمپ میں اُس کی چار سہیلیاں تھیں۔ عجیب اتفاق دیکھیے کہ مصنوعی اور حقیقی دونوں کہانیاں رمضان کے مبارک مہینے میں ہی اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔

حلیمہ کی ماں حلیمہ کے ابو سے: حلیمہ جا رہی ہے دیکھیں کرکٹ اُس کی زندگی ہے کھیلنے دیں اُسے

باپ: میں نے کہا نا لڑکیاں کرکٹ نہیں کھیلتیں۔ میں تُم دونوں کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں کہ یہ بھیڑیوں کا معاشرہ ہے۔ حلیمہ کو دیکھنے والے کسی کرکٹر کو نہیں دیکھیں گے۔ سب کو میدان میں اُچھلتی کُودتی عورت نظر آئے گی۔ تُم دونوں نے مُجھے نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ میں خُود اسی معاشرے کا ایک مرد ہوں۔ میں جانتا ہوں یہاں انسان کی کھال اوڑھے بھیڑیے دندنا رہے ہیں۔ تُم میری حلیمہ مُجھ سے چھین رہی ہو۔

منظر بدلتا ہے۔ حلیمہ کھیل کے میدان سے۔ ماں: بیٹا ٹریننگ کیسی چل رہی ہے؟

حلیمہ: بہت اچھی چل رہی ہے امی !! (ماں کو حلیمہ کی دبی دبی سسکیاں سُنائی دیتی ہیں)

ماں: کیا ہوا بیٹا!! کیا تُم رو رہی ہو!! (جواب میں سسکیاں) حلیمہ تُم ٹھیک تو ہو نا!!

حلیمہ: جی امی میں بالکل ٹھیک ہوں!! بس ذرا نزلہ ہے ہلکا پُھلکا۔۔۔۔ اور تھوڑی نروس بھی ہوں۔ فائنل سیلیکشن ہے۔ پس منظر میں ٹیم سیلکٹر جاوید صاحب کی آواز گُونجتی ہے...... حلیمہ...... جی سر آئی !!

حلیمہ میدان میں کھڑے مُلتان کرکٹ کلب کے صدر مولوی محمد سُلطان عالم انصاری اور ٹیم سیلیکٹر محمد جاوید کی بُھوکی نظروں کے نشانے پر گھبراتی ہوئی پریکٹس میں مشغول ہو جاتی ہے۔ حلیمہ کی ماں کو خوشی سے چیخنا نہیں پڑتا۔ حلیمہ کے محلے میں مبارک مبارک کے نعرے نہیں گُونجتے۔ منظر نہیں بدلتا۔ ماں حلیمہ سے نہیں پُوچھتی کہ افطار کی تیاریاں ہو گئیں بیٹا...... حلیمہ کا پہلا میچ نہیں آتا کہ ماں کی دعا کی ضرورت پڑتی۔ ہاں حلیمہ پر بھی روزہ افطار کا وقت آ جاتا ہے...... لیکن افطار سے بہت پہلے۔ جی ہاں حلیمہ نے ایک دن مُلتان کرکٹ کلب کے صدر مولوی محمد سُلطان عالم انصاری اور ٹیم سیلکٹر محمد جاوید کی دست درازیوں اور فرمائشوں سے تنگ آ کر اپنا روزہ زہر کی بھری بوتل سے افطار کر لیا تھا۔ سُنا ہے کہ ہر عید الفطر پر مُلتان کے ایک قبرستان میں ایک قبر کے سرہانے ایک سنگدل باپ اپنا سر گُھٹنوں میں دبائے روتا رہتا ہے۔

عابی مکھنوی (سوشل میڈیا سے)

ہمارے بچے

نورافراء۔لاہور

ہمارے معاشرے کا اہم رکن ہمارے بچے ہیں اوران بچوں کی تربیت ان سے بھی زیادہ اہم ہے۔کچھ برسوں پہلے کی ہی تو بات ہے کہ جب میری امی مجھے تربیت دے رہی تھیں ہاں یہ بات کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ان کی تربیت میں صرف زبان ہی نہیں آنکھیں ، ہاتھ ، جوتا اور بعض اوقات ہاتھ میں آنے والی کوئی چیز بھی ہوسکتی تھی۔تربیت تو کیا تھی مجھے لگتا کہ بس ہر وقت کسی قید خانے میں ہیں جہاں صبح ہوتے ہی نماز اور سپارے کے لئے اٹھایا جاتا ہے اور سخت سردی میں بھی بستر سرکا دیا جاتا ہے ۔ سپارے کے لئے مسجد بھیج دیا جاتا ۔ واپسی ہوتی تو کھانے کے ڈبوں کے ساتھ ساتھ بستے یونیفارم ہمارے منتظر ہوتے۔

بس پھر سکول کے لیے نکلتے ہوئے امی کی آواز ہمارا پیچھا کرتی کہ آج دادا ابو کے ساتھ ساتھ سکول سے واپس آنا اگر کوئی شکایت ملی تو آج تو ضرور تمہارے ابو کو بتاؤں گی۔سکول سے واپسی ہوتی تو آگے کھانا تیار ہوتا مگر اس سے پہلے نہاؤ کپڑے بدلو پھر آ کر کھانا کھا لو۔ جو جتنی جلدی سب مراحل طے کرتا وہ اتنی جلدی کھانا کھاتا۔

کھانے کے بعد نماز ظہر اور پھر سب کو سوجانے کا حکم ملتا۔بس پردے گر جاتے اور سب وہیں سو جاتے اور پھر عصر پڑھنے کے لئے اٹھایا جاتا اور ہوم ورک اور یونہی رات ہوتی۔رات کے کھانے کی باری ہے تو دسترخوان پر بیٹھے ہیں کہ کھانے میں میری پسند کا تو کچھ نہیں بس امی کا ہی کوئی دل پسند سالن ہوگا۔اصرار کرنے پر جواب آیا کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ جا کر وقت پر اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹ جاؤ۔بس پھر کیا کہیے کہ کھانا خود بخود اندر اترتا جاتا۔

یہ تو گھر کا دسترخوان ہے کہیں مہمان خصوصی بھی ہوتے تو ہماری کیا مجال کہ فرمائشی کھانا ہو۔ایک ہی آواز دسترخوان پر بلند ہوتی ، باجی! میرے بچے سب کچھ کھا لیتے ہیں، کھانے میں جو ہوگا وہی کھائیں گے۔آنکھوں سے ہم پر منہ بند رکھنے کی مہر بھی لگادی جاتی۔اس کے باوجود کوئی غلطی پکڑی جاتی اور واپسی پر ایک ہی دھمکی کہ آئندہ کہیں نہیں لے کر جاؤں گی، اتنا نخرہ ہے تو گھر میں ہی رہا کرو۔پھر وہی معافی مانگنا کہ آئندہ نہیں کریں گے۔

رات کے وقت ابو کے گھر آنے پر سارا گھر ہی سو رہا ہوتا تھا۔نو بجتے ہی بستر ہمارے حوالے کر دیا جاتا۔ نیند آئی ہے یا نہیں کسی کی آواز نہ آئے اور بس سب سو جاؤ۔بس اتوار کے آنے کے انتظار میں پورا ہفتہ سر تسلیم خم کرتے رہتے ۔ اتوار کے دن امی ابو ہمارے ساتھ کھیل میں مشغول ہوتے ۔ وہ کھلونے جو پورا ہفتہ ایک قید میں ہوتے آج ان کی رہائی ہوتی اور پھر ہم پورا دن اس کی خوشی میں جھومتے۔اس دن ہمارے امی ابو چپ رہتے اور ہمیں سنتے کہ پورا ہفتہ کیا کیا۔اتوار ہی کے دن وہ ہمیں پھر محبت وشفقت سے پرخلوص انداز میں چند نصیحتیں بھی کرتے اور تربیت کے نقطہ نظر سے کچھ چیزوں کو روشناس کرواتے۔

آج کے دور میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔بچوں کو اتنی سہولیات فراہم کردی جاتی ہیں کہ وہ والدین کو ہی بھول جاتے ہیں۔پھر ماں ہی کہتی ہے کہ میری اولاد نافرمان ہے مگر ایسا کرنے میں خود ماں کا ہاتھ ہے۔بچوں کو ان کے فرائض بتائیں، آداب سکھائیں استاد کا احترام رشتہ داروں ، دوستوں کا ۔بچے جو مستقبل کے معمار ہیں ان کی اپنی بنیاد کمزور ہو رہی ہے۔

مائیں ان سب سے بے خبر اپنے کچن اور گھر کی صاف ستھرائی میں مصروف ہیں۔ مائیں یہ کہہ کر انہیں اکیلا چھوڑ دیتی ہیں کہ وہ پڑھائی کر رہے ہیں انہیں تنگ نہیں کرنا۔بچوں کو پہچان ہی نہیں اس پاک ذات کی جس کے توسط سے یہ سب بہاریں ہیں۔ہمیں اللہ کی محبت ان کے

دلوں میں ڈالنی چاہیے اور نعمتوں کی پہچان کروانی چاہیے کہ اللہ نے ہمیں تمام نعمتوں سے نوازا تو شکر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم عاجز ہوں اور نعمت کو اللہ کے پسند کے کاموں میں لگائیں۔ اسی طرح وقت بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے جسے اللہ کی پسند کے کاموں میں لگانا ہے۔

بچوں کے ساتھ معاملہ نرمی سے ہوجتنی نرمی سے معاملہ ہوگا وہ اتنی جلدی آپ کی آواز پر ''جی'' کہیں گے۔ ان کی تربیت پورے خالص ہو کر تڑپ سے کریں۔ ان کی بے جا خواہشات کو چاہے پورا نہ کریں مگر ان کی روحانی غذا ان کو ملتی رہنی چاہیے۔ بچوں کی غلطی پر فوراً ڈانٹ ڈپٹ نہ شروع کریں۔ انہیں مہلت دیں اور پھر نرمی سے سمجھائیں۔ اللہ سبحان وتعالیٰ کی صفت ہے کہ بندہ جتنے بھی گناہ کرے وہ اُسے مہلت دیتا ہے اور پھر کسی طریقے یا ذریعے سے اُسے نصیحت کرتا ہے، نرمی سے معاملہ کرتا ہے۔

☆......☆......☆

نسرین قریشی ایک انمول ہیرا

تنویر خانم۔ کراچی

اللہ کی توفیق سے میں نے اکتوبر 1996 میں گلشن اقبال میں قرآن پاک کی ترجمے اور تفسیر کی کلاس کا آغاز کیا۔ کلاس کی ابتدائی شاگردوں میں رضوانہ طاہر، فوزیہ سہیل وغیرہ کے ساتھ نسرین قریشی بھی شامل تھیں۔

بہت توجہ سے سیکھنے اور سمجھنے کے عمل میں دلچسپی لیتیں۔ وہ اپنے محلے میں بادام پر قل ھو اللہ پڑھنے کا پروگرام ہفتہ وار خاصے اہتمام سے کرتی تھیں۔ میں نے نسرین بہن کو مشورہ دیا کہ آپ کے ہاں خواتین کی بڑی تعداد اکٹھی ہوتی ہے کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن پاک کا درس بھی ان تک پہنچا دیں۔ نسرین کے اندر فہم قرآن کا ذوق وشوق موجود تھا۔ لہٰذا انہوں نے میرا مشورہ مان لیا اور درس کا آغاز کر دیا جو خاصا متاثر کن ہوتا۔ خود میں نے بھی اکثر سامع کی حیثیت سے اٹینڈ کیا اور دل کو تقویت ملی۔ پھر یوں ہونے لگا کہ اگر میں کسی ذاتی مجبوری کی بنا پر اپنی کلاس نہیں لے پاتی تو نسرین بہن کو فون پر ترجمہ لکھوا دیتی توجہ طلب نکات انہیں نوٹ کراتی پھر وہ اس علم کو اپنے کلاس کی ساتھیوں کو منتقل کر دیتیں اور بحسن وخوبی کرتیں۔ گویا کلاس آف نہ ہوتی۔ سوالات کے جوابات بھی میں نسرین بہن کے ذریعے فون پر دے دیتی۔ وہ تفہیم سے مطالعہ کر کے اہم نکات کو کلاس میں زیر بحث لاتیں جس سے ان کی فہم وفراست کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ وسیع المطالعہ تھیں اور دیگر تفاسیر بھی شوق سے پڑھتی تھیں۔ بعد میں جب آنکھوں کی تکلیف سے گزرنا پڑا تو مطالعہ بھی متاثر ہوا۔

نسرین بہن کی شخصیت کا ایک اور پہلو جس نے انہیں اپنے حلقے میں معتبر ومہربان ساتھی اور پڑوسی کا رتبہ دلایا تھا وہ ان کی معاملہ فہمی تھی۔ خواتین کو مختلف مسائل کے حل اور مخصوص مواقع پر پڑھنے والی دعائیں بتاتی تھیں۔ ہر ایک کی مدد کو ہمہ وقت تیار رہتیں پروگراموں کی تیاری کا موقع ہو، کلاس میں کوئی نازک موڑ آ گیا ہو، کسی کی ذاتی الجھنیں ہوں، ان کے رائے صائب ہوتی۔

ساتھیوں کے آپس کے اختلافات کو بحسن وخوبی تصفیہ کراتیں۔ میں بھی اپنی ذاتی پریشانیاں ان سے شیئر کر کے ہلکی ہو جاتی وہ ایک معاملہ فہم، قابل اعتماد اور بہترین راز داں تھیں۔

مہمان نوازی بھی ان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ بہت سی بدعات سے تائب ہو چکی تھیں۔ ربیع الاول میں درود شریف کی محافل کا اختتام نسرین بہن کے درس حدیث اور بہترین عشایئے پر ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے حب رسولؐ کے جذبات کو قبول فرمائے۔

آخر دنوں میں جب موذی بیماری نے سر سے پیر تک انہیں لپیٹ میں لے لیا تھا، کیموتھراپی کی تکلیف دہ مراحل جاری تھے، وہ ترجمے کی کلاس میں آخر تک شریک ہوتی رہیں۔ ایک بار مجھے پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوئی جب پہنچی تو دیکھا کہ نسرین بہن تفسیر سمجھا رہی ہیں۔ بے اختیار دل سے ان کے لئے دعا نکلی اور پھر میں نے کہا نسرین بہن میرے آنے سے پہلے آپ اسی طرح شروع کر دیا کریں۔

ان کی کیموتھراپی ہی کے دوران ایک دن میں نے کلاس میں دعوت دین دوسروں تک پہنچانے اور ترجمہ قرآن سکھانے کے لئے پھر توجہ دلائی تو باوجود طبیعت کی خرابی کے سب سے پہلے انہوں نے خود کو پیش کر دیا اور کہا اپنی کلاس میرے گھر پر لے لیا کریں۔ میں کلاس سے پہلے ترجمہ پڑھا دیا کرونگی۔ میں نے کہا ابھی آپ کی طبیعت خراب ہے

اتنا بیٹھنا آپ کے لئے تکلیف دہ ہوگا۔ کہنے لگیں اللہ کا کام ہے وہ خود کرائے گا۔لہٰذا ان حالات میں بھی نسرین بہن نے قرآنی ترجمے کی کلاس اپنے گھر میں شروع کی اور خود ہی تدریس کا آغاز کیا۔بمشکل چند کلاسیں لے پائی تھیں کہ اللہ کے یہاں سے بلاوا آ گیا۔ میں نہیں بھول سکتی کہ جان لیوا بیماری کے آخری دن درس دینے کے بعد سانسیں پھولتے ہوئے بڑی مسرت اور ایک کیفیت سرشاری کے ساتھ کہا، سچی آپا بہت مزا آیا۔ کوشش کرنا کہ میرے بعد بھی یہ کلاس اسی طرح جاری رہے۔

مجھے چپکے سے بتایا کہ میں ہفتہ کو جارہی ہوں امریکہ، رپورٹ اچھی نہیں آئی بیٹے بلا رہے ہیں کہ ہم یہاں ڈاکٹروں کو دکھائیں گے۔ وہاں جا کر بیماری مزید بڑھ گئی۔آخر وقت میں بول نہیں سکتی تھیں صرف سن لیتی تھیں۔ بیٹے نے موبائل کان سے لگا دیا تو میں نے بھی تھوڑی تسلی آمیز گفتگو کر لی۔اس حال میں قریبی لوگوں نے دیکھا ہونٹ ہل رہے ہیں۔گویا اس وقت بھی رب تعالیٰ کو یاد کر رہی تھیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ مرحومہ کا چھوڑا ہوا مشن تکمیل کو پہنچے اور ان کے لئے صدقہ جاریہ بنے آمین۔

☆......☆......☆

حیا کیا ہے

کرن وسیم۔کراچی

عموماً ہمارے نزدیک شرم وحیا اور ستر پوشی کے تقاضوں کے مطابق لباس اور اس کا اہتمام، بس یہ ہی حیا کا مفہوم ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس میں کچھ غلط بھی نہیں ہے، لیکن یہ حیا کا محدود تصور ہے، جامع اور مکمل مفہوم نہیں ہے۔

حیا، دراصل ایک رویہ ہے جس سے ایک مکمل ومربوط اخلاق وکردار تشکیل پاتا ہے۔زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے والا یہ تصور حیا ہے جو ہمیں دین اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی تعلیمات میں ملتا ہے۔ پیارے نبیؐ نے حیا کو ایمان کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس میں حیا نہیں اس میں ایمان نہیں۔

دراصل یہ انسان کا عقیدہ اور اس کا ایمان ہی تو ہے جو اسے اعمال صالحہ کے لئے تیار کرتا ہے۔ایمان کی پختگی سے ہی ایک مومن مشکل سے مشکل حالات میں بھی صبر و رضا کا دامن نہیں چھوڑتا۔ وہ تنہا ہو یا ہجوم میں اس کی ایمانی حالت اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتی۔اس کے اندر ودیعت کردہ فطری حیا اسے اپنے خالق کی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے گناہ اور معصیت سے روکے رکھتی ہے۔

آنحضورؐ اپنے صحابہ کرامؓ کی تربیت میں حیا کے عنصر کو خصوصی اہمیت دیتے تھے ترمذی کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ ''اللہ سے حیا کیا کرو۔'' صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔اس پر آپؐ نے فرمایا۔'' ایسے نہیں، بلکہ اللہ سے حیا کا حق یہ ہے کہ تم اپنے دل ودماغ میں آنے والے خیالات کی بھی جانچ کرتے رہا کرو۔''

لیکن افسوس کہ ہم مسلمان حیا کو ایک ظاہری رویہ ہی سمجھتے ہیں۔ جبکہ یہ ایک بھرپور اخلاقی طاقت ہے جو فرد کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کو بھی پاکیزہ کرتی ہے اور اخلاق وکردار کی بلندی عطا کرتی ہے۔باحیا انسان ہر طرح کی فکری وعملی آلودگی سے بچنا چاہتا ہے۔

دورِ جدید میں میڈیا نے جس طرح افراد کی زندگی اور رہن سہن کے طریقوں کو تبدیل کیا ہے اس سے اجتماعی رویوں میں بہت تبدیلی آئی ہے۔حیا اور اسلامی معاشرتی اقدار کو مسلسل نشانے پر رکھ لیا گیا ہے۔ بدتہذیبی اور بے حیائی کو جدیدیت اور فیشن کا نام دے کر ہماری حیا اور اخلاقیات پر گہری ضرب لگائی گئی ہے۔خود اعتمادی (confidence) کے نام پر نوجوان نسل کو بے راہ روی کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔

کمرشل ازم اور کنزیومرازم کے زیر اثر میڈیا پر دکھائے جاتے ہیں جن سے پر تعیش زندگی کے فرضی مناظر لوگوں کی نفسیاتی خواہشات بھڑکتی ہیں۔ ان ہی خواہشات کی تکمیل کے لئے حلال وحرام، جائز وناجائز کا لحاظ کرنا چھوڑ دیا گیا ہے۔غیرت وشرافت جانچنے کے پیمانے بدل گئے ہیں۔اب عزت واقتدار صرف دولت والوں کا حق ہوگیا ہے

چاہے وہ دولت کسی بھی طریقے سے کمائی گئی ہو۔

بات صرف جسمانی بے حیائی تک نہیں رہی، معاشرہ اخلاق و کردار کی بے حیائی کا بھی شاہکار بن گیا ہے۔ محرم نامحرم کی تمیز ختم کر دی گئی ہے اس سے جو فتنے کھڑے ہوتے ہیں وہ پوری طرح معاشرے میں نمایاں ہیں بے ہودہ ڈراموں، اشتہاروں اور فلموں نے اجتماعی بے حسی کو فروغ دیا ہے۔ اب کوئی منظر اخلاقیات کے منافی لگتا ہی نہیں ہے۔ پورا خاندان ماں باپ، بہن بھائی، بچے اور بزرگ ایک ساتھ بیٹھ کر آرام سے ایسے مناظر دیکھ لیتے ہیں بلکہ اقدار کے منافی پروگراموں پر تبصرہ بھی کرتے ہیں۔

حیا ختم ہو جانے کا ایک مظہر بڑھتی ہوئی گداگری بھی ہے۔ آپ گھر سے باہر نکلیں کسی بھی پبلک مقام پر چلے جائیں آپ کو عام افراد کی تعداد کے برابر ہی گداگروں سے واسطہ پڑے گا۔ اچھے خاصے صحت مند، جوان مرد و خواتین، نئے نئے ہتھکنڈوں اور فرضی کہانیوں اور دکھڑوں سے لیس۔ ان میں کچھ تعداد مستحقین کی بھی ہوتی ہوگی۔ مگر اب ہر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا، لگاتار مانگنا، مسلسل پیچھے لگ جانا، کوئی دھتکارے یا معذرت کرے تو بھی پیچھا نہ چھوڑنا عام ہے۔ آپ اسے بے حیائی کہہ لیں یا ڈھٹائی۔ اللہ کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے گریز کرنا، اب یہ تصور قدیم ہوا۔ اب ہر کسی سے مانگنے میں حیا شرم کی ضرورت نہیں۔ جس قوم کے حکمرانوں کے کروڑوں ڈالرز کے سوئس اکاؤنٹس ہوں پھر بھی وہ کاسۂ گدائی لیے دنیا بھر میں مانگتے پھرتے ہوں۔ اس قوم میں عزت نفس، سفید پوشی اور حیا و خودداری جیسی صفات کہاں باقی رہیں گی۔ سو یہ ہی حال ہے ہر طرف گداگر ہیں اور دیگر افراد اس تذبذب میں کہ مستحق کون ہے کس کو دیں اور کس کو نہ دیں۔

ارباب اقتدار کو ان کی کارکردگی پر آئینہ دکھایا جائے تو وہاں بھی بے حیائی اور ڈھٹائی پوری آن بان کے ساتھ براجمان۔ وہ اپنی بداعمالیوں کو اپنا حق سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔

انجام کار یہ ہے کہ زندگی کے ایک شعبہ سے حیا ختم ہوئی تو دیگر تمام شعبوں سے بھی اس کا خاتمہ ہوا۔ ہم بحیثیت ایک قوم کے اپنی اقدار و روایات اور شاندار تہذیب کو بے حیائی اور بے حسی کے سمندر میں غرق کر کے ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھ سکیں گے یا نہیں؟ لیکن یہ ایک انتہائی گھاٹے کا سودا ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو کیسا معاشرہ منتقل کرنے جا رہے ہیں۔

☆......☆......☆

اکثر یہ ہوتا ہے

زینب وسیم قائم خانی۔ کراچی

شودر لڑکی سوچ رہی ہے
مندر کی چوکھٹ پر رہ کر
میرا کام بھجن پڑھنا ہے
ماں کہتی ہے
میری مدھر آواز کا جادو تو
بھگوان کے دل پر بھی چلتا ہے

مگر اکثر یہ ہوتا ہے
کہ جب سورج نکلتا ہے
ہوا کچھ اور کہتی ہے
گھٹا کچھ اور کہتی ہے
کلی جب پھول بنتی ہے
پرندے آشیاں سے اڑ کے جب
پربت کو چھوتے ہیں
ہوائیں لا دکر بوندوں کو آتی ہیں
برس کر بارشیں مندر کے آنگن میں لگی
تلسی کو دھوتی ہیں
عجب اسرار کھلتے ہیں
عجب انوار ہوتے ہیں
میرا دل کان میں آ کر
مدھر سرگوشیوں کے بیچ
جیسے خود بخود ہی
لا الٰہ کہنے لگتا ہے☆

عید کا دن

عید کا تصور تہوار کے طور پہ پہلا خوشی کا تصور ہے، جو ہمیں عجب ترنگ دیتا ہے۔عید امیر کی ہو یا غریب کی بچپن کے حسن کا انمٹ اور انمول احساس ہوتا ہے۔عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ تصور اپنے رنگ بدلتا ہے اور خوشی سے زیادہ احساس ذمہ داری غالب آجاتا ہے۔اپنے بچوں کو عید پہ خوش ہوتے دیکھ کر بڑے بھی خوش گواری محسوس کرتے ہیں۔

عید کی خوشیاں بچے ہی زیادہ محسوس کرتے ہیں۔

ان کے درمیان نزاع نہیں ہوتا۔وہ ایک دوسرے کو دکھی نہیں کرتے۔سادہ دل اور معصوم ہوتے ہیں،انسانی رشتوں میں سب سے مضبوط رشتہ بچوں کے درمیان ہوتا ہے۔رنگ،نسل،امیری غریبی سے ماوراا پنے بڑوں کے درمیان نزاعات سے بے پرواہوکر خالی الذہن ہوکر، یہی وجہ ہے کہ عید بچوں کی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب یہ آیت(**و نزعنا ما فی صدورھم من غل**) نازل فرمائی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بچوں کی طرح خوش ہوئے۔یہ وہ لوگ تھے جو تقویٰ کے امتحان کے لئے چن لئے گئے تھے قیامت تک کے لئے رول ماڈل بنائے گئے۔ان کے دل اللہ کی محبت سے سرشار تھے اور اللہ تعالیٰ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے ایک دوسرے کے لئے ایثار کا نمونہ تھے''مواخات'' کی بہترین مثال قائم کر کے دکھائی جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جنت کی بشارتیں انہی کو مل چکی تھیں......رضی اللہ عنھم کا پروانہ مل چکا تھا......اس کے باوجود!

اس آیت کو سن کر صحابہ نے اپنے دلوں میں ٹھنڈک محسوس کی اور پورے مدینے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انسانی جذبات کے بہت سے پہلو ہیں اور مزاجوں کے اختلاف، بہت سے معاملات متنازعہ بنا دیتے ہیں......کسی بھی معاملے میں تنازعہ غیر فطری نہیں ہے۔وہ انسان(صحابہ کرامؓ) جو اس کرہ ارضی پہ نمونے کے طور پہ اتارے گئے ان میں بھی تنازعات ہوتے تھے، اور انسانی مزاج وطبیعتوں کا اختلاف ان کو بہت دور بھی لے جاتا تھا۔انسانی خصلتیں بدلنا آسان کام نہیں پہاڑ ہلانے سے بھی زیادہ مشکل کام کسی کی خصلت بدلنا ہے۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کشاکش کے واقعات طویل عرصہ بھی چلے۔مگر اس آیت نے ان کو وہ نکتہ سمجھایا جس سے زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔رنجشوں نے شعائر اسلام پہ آنچ نہیں آنے دی حقوق وفرائض کے معاملات سہولت سے چلتے رہے۔

دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان چھوٹے بڑے نزاع رہے اور خود رسول اللہؐ نے ان کے درمیاں تصفیہ کرایا مگر اس آیت مبارکہ میں اس تصفیہ کی بات ہے جو خود اللہ رب العزت فرمائیں گے محبت سے پیار اور شفقت سے دونوں فریق برابر اپنے دل گرما رہے ہوں گے۔وہ نقطہ نظر جس کی زبر زیر ہی سمجھ میں نہ آتی تھی اب نظر بھی دور تک جائے گی اور نقطہ بھی لاینحل نہ لگے گا۔دونوں جنتی ہوں گے دونوں اللہ کو محبوب ہوں گے اس لئے کہ وہ تو ستر ماؤں سے بڑھ کے رحیم ہے وہ اپنے بندوں پہ رؤوف رحیم ہے۔وہ اپنے بندوں کے دل ایک دوسرے کے لئے صاف کر دے گا۔دنیا میں جو آپس کی رنجشیں،غلط گمانیاں،جذباتی کیفیت میں مبتلا ہو کر زیادتیاں کی تھیں ان کے اثرات ختم کر دے گا۔ وہ مخلص دوستوں کی حیثیت سے جنت میں داخل کئے جائیں گے۔کسی کی شکل دیکھ کر کسی کو یاد نہ آئے گا کہ وہ میرا مخالف تھا، مجھ پہ تنقید کی تھی اللہ سب

مومنوں کے دل صاف کردے گا۔ دلوں کے وہ رنج جو بھلائے نہیں بھولتے تھے ان کو بھول جانے کی قدرت دے دے گا۔ اسی آیت کو پڑھ کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ’’مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اور عثمان اور طلحہ اور زبیر (رضوان اللہ علیہم) کے درمیان بھی تصفیہ کرادے گا۔‘‘

اور یہی وہ عید کا اصلی حقیقی اور سچا دن ہوگا۔

’’اور جو کینے ان کے دلوں میں ہوں گے سب نکال ڈالیں گے۔ ان کے محلوں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ الحمدللہ کہ اس نے ہمیں یہاں کا رستہ دکھایا اگر اللہ ہمیں یہ رستہ نہ دکھاتا تو ہم کبھی یہ سیدھا رستہ نہ پاسکتے۔‘‘(الاعراف)

’’اور ان کے دلوں میں جو کدورت ہوگی وہ ہم بالکل صاف کر دیں گے اور سب مومن بھائی بھائی بن کر تختوں پہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے(الحجر)‘‘

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ امت مسلمہ کو دنیا کی سچی عید نصیب فرمائے اور جنت کی عید سے بھی ہمکنار کرے۔ آمین

☆..........☆..........☆